الرسالہ
Al-Risāla

April 2001 • No. 293 • Rs. 10

جو آدمی اپنی غلطی کو نہیں مانتا وہ اپنے آپ کو اس خطرہ
میں مبتلا کرتا ہے کہ وہ دوبارہ اسی غلطی کا ارتکاب کرے۔

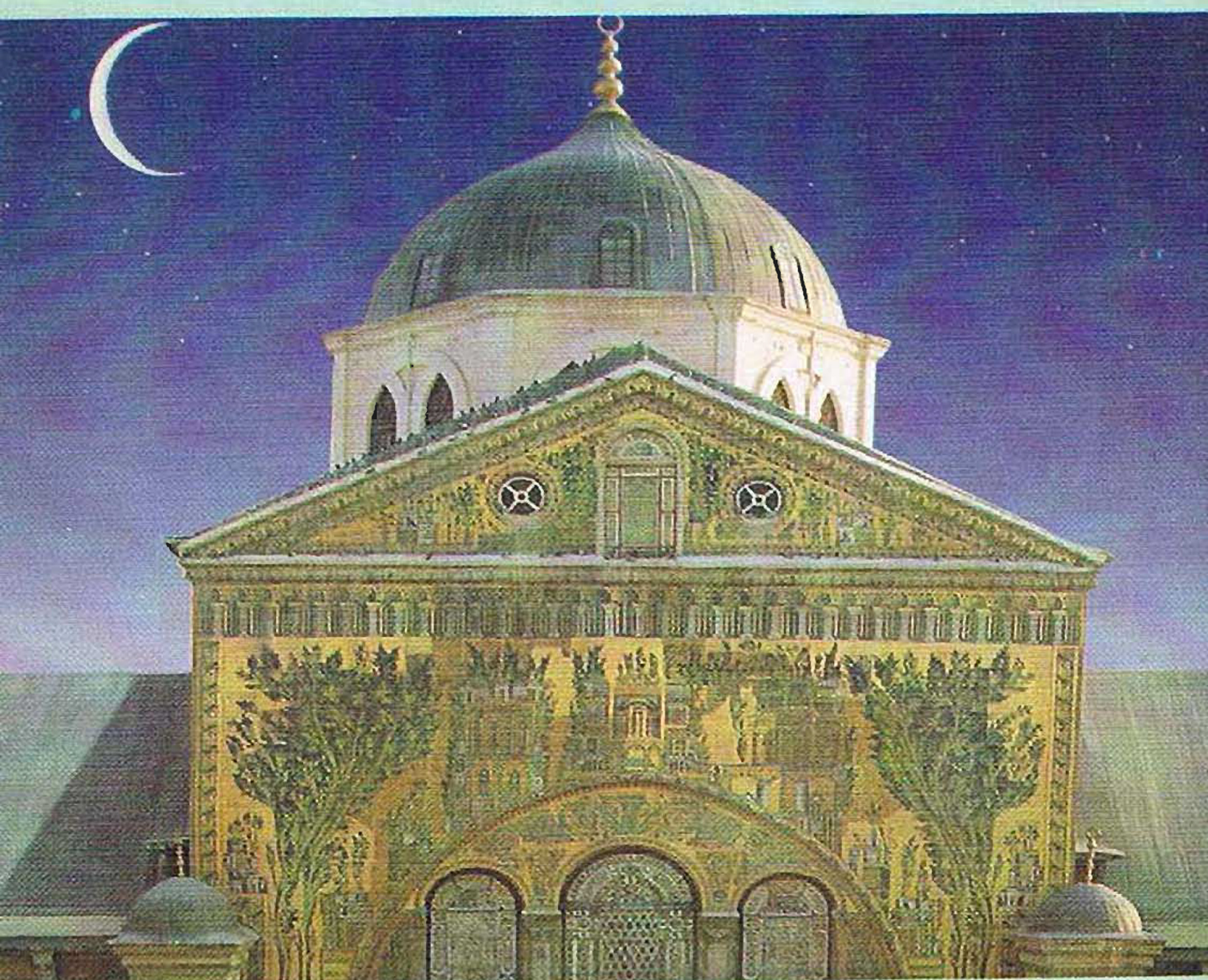

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market,New Delhi-110013
Tel. 462 5454, 461 1128,
Fax 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
5801 SW 106th Street,
Ft. Lauderdale, FL 33328
U.S.A. Tel./Fax 718-2583439
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.

الرسالہ، اپریل ۲۰۰۱

فہرست

قربتِ خداوندی	4
مایوسی نہیں	5
دعوت الی اللہ	6
تاریخی پیغمبر	7
حقیقی عبادت	8
مسائل کے باوجود	9
اقامت الدین تفرق فی الدین	11
سوال وجواب	31
ایک خط	41
خبر نامہ اسلامی مرکز	44

قربت خداوندی

ایک حدیث میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ: مرضت فلم یعدنی ابن آدم (مسند احمد ۲/۴۰۴)۔ یعنی میں بیمار ہوا مگر ابن آدم نے میری عیادت نہیں کی۔ اس کی وضاحت خود حدیث میں اس طرح ہے کہ اگر ابن آدم فلاں مریض کے پاس جاتا تو وہ مجھ کو وہاں پاتا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا اس مریض کے پاس اسی طرح موجود تھا جس طرح کوئی انسان ایک مریض کے پاس موجود ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اگر سچے جذبہ کے ساتھ مریض کی عیادت کرے تو اس عمل کے دوران وہ ملاقات رب کا تجربہ کرے گا۔ یہ الفاظ تجربۂ رب کے معنی میں ہیں نہ کہ مشاہدۂ رب کے معنی میں۔

ایک مومن کے علم میں یہ بات آئی کہ خدا کا فلاں بندہ بیمار ہے۔ مومن کے دل میں اس کے ساتھ ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ اس نے اس کے حق میں دعا کی۔ پھر وہ اس کی ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ روانہ ہوا تاکہ اس سے مل کر اس کا حال دریافت کرے اور اس کی عیادت کرے۔ یہاں تک کہ وہ مریض کے پاس پہنچا۔ اس نے سچی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت اسے دیکھا: اس کے حق میں سچے جذبہ کے تحت دعائیں کیں۔ اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھا اور دل سے اس کے اندر یہ جذبہ ابھرا کہ اللہ اس کو جلد سے جلد صحت مند کر دے۔

یہ پورا عمل جو کہ تمام تر خدائی جذبہ کے تحت تھا، اس کے دوران برابر خدا کا تصور اس کے ذہن پر چھایا رہا۔ مریض سے ربط کے دوران وہ ہر لمحہ قربت خداوندی کا تجربہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ شدت احساس سے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

یہی مطلب ہے ان الفاظ کا کہ اگر انسان اپنے بھائی کی مخلصانہ عیادت کرے گا تو وہ وہاں خدا کو پائے گا۔ اس کے احساسات کی دنیا میں خدا اتر آئے گا۔ مریض کی عیادت اس کے لئے ملاقات رب کا تجربہ بن جائے گی۔

حج ـــــ تکمیل حیات

حج کیا ہے۔ حج اہل اسلام کی عالمی عبادت ہے۔ ایک خاص وقت پر ساری دنیا کے مسلمان مکہ میں جمع ہوتے ہیں۔ جہاں پیغمبروں کی تاریخ ثبت ہے۔ یہاں عبادتی ماحول میں وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ یہاں کی مخصوص روحانی فضا میں وہ ایک دوسرے کا تعارف حاصل کرتے ہیں۔

ان مسلمانوں میں مختلف ملکوں کے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ ان کے رنگ اور ان کی عادات ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس قسم کے فرق اور اختلاف کے باوجود وہ ایک امت کی طرح مل کر عباداتی رسوم ادا کرتے ہیں۔ وہ ایک ہی کعبہ کے گرد طواف کرتے ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں یکساں عبادتی اعمال انجام دیتے ہیں۔

حج امت مسلمہ میں عالمی اتحاد پیدا کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ حج کی یہ سالانہ عبادت امت کے اندر یکسانیت کا احساس پیدا کرنے میں سب سے بڑا کردار ادا کرتی ہے۔ زمین کے مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے لوگ جب اس طرح ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ان کا یہ یقین بڑھ جاتا ہے کہ وہ ایک عالمی دین کا حصہ ہیں۔

حج کے بہت سے فائدے ہیں۔ ان میں سے ایک مساوات ہے۔ حج کے موقع پر انسانی برابری کا جو مظاہرہ ہوتا ہے اس کی کوئی دوسری مثال کہیں موجود نہیں۔ اس طرح حج اس بات کی عظیم تربیت ہے کہ لوگ فرق اور اختلاف کے باوجود باہم امت واحدہ بن کر رہیں۔ اس طرح حج دین کے لئے قربانی کرنے کا جذبہ ابھارتا ہے۔

حج کے مقامات میں جو غیر معمولی کشش ہے وہ زائرین کے اندر روحانیت جگانے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ یہاں کے تجربات اور مشاہدات کے دوران سینوں میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ دل اللہ کی یاد سے معمور ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں آنسو بہا کر قربت الٰہی کا تجربہ کرتی ہیں، وغیرہ۔ حج نہ صرف ایک افضل عبادت ہے بلکہ وہ زندگی کی تربیت کا ایک مکمل کورس ہے۔ حج کے بغیر آدمی اپنی زندگی کی تکمیل سے محروم رہتا ہے۔

دعوت الی اللہ

موجودہ دنیا میں انسان کو آزمائش کے لئے رکھا گیا ہے۔ جو شخص اس دنیا میں اللہ کی مرضی پر چلے گا وہ موت کے بعد ابدی جنت میں داخل کیا جائے گا۔ اور جو شخص اللہ کی مرضی سے انحراف کرے گا وہ موت کے بعد جہنم کا مستحق قرار پائے گا۔ یہ زندگی کی سب سے زیادہ سنگین حقیقت ہے۔ اسی حقیقت سے انسانوں کو باخبر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے پیغمبر بھیجے۔ اور آخر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آخری نبی کی حیثیت سے مبعوث فرمایا۔ یہ پیغام رسانی تمام اہم کاموں میں سب سے زیادہ اہم کام ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہو گئی۔ مگر کار نبوت اب بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا۔ پہلے جو کام نبیوں کے ذریعہ انجام پاتا تھا وہ اب امت مسلمہ کے ذریعہ انجام پائے گا۔ مسلمان ختم نبوت کے بعد مقام نبوت پر ہیں۔ ان کی یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ خدائی پیغام رسانی کے کام کو مسلسل جاری رکھیں۔ اگر وہ اس کام کو نہ کریں تو قیامت کے دن وہ اللہ کی گرفت میں آجائیں گے۔ اور کوئی بھی دوسرا عمل انہیں اس سے بچانے والا ثابت نہ ہوگا۔

مسلمان کا تعلق دوسری قوموں سے داعی اور مدعو کا تعلق ہے۔ داعی کی حیثیت سے مسلمانوں کو دوسری قوموں کی زیادتیوں کو برداشت کرنا ہے۔ انہیں یک طرفہ طور پر دوسری قوموں کا خیر خواہ بننا ہے۔ اس کے بغیر وہ فضا پیدا نہیں ہو سکتی جس میں دعوت الی اللہ کا کام موثر طور پر انجام دیا جائے۔

یہ وہی کام ہے جس کو قرآن میں انذار و تبشیر کہا گیا ہے۔ یعنی تمام انسانوں کو زندگی کے بارے میں خدا کی اسکیم سے باخبر کرنا اور یہ بتانا کہ موت کے بعد والے مرحلۂ حیات میں ان کے ساتھ ان کا خدا کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ یہ ایک خالص غیر سیاسی اور غیر دنیوی کام ہے۔ اور اس کو اسی خالص انداز میں انجام دیا جانا چاہیے۔

تاریخی پیغمبر

قدیم مکہ میں مسیحی عالم ورقہ بن نوفل نے پیغمبر اسلام سے کہا تھا: کاش کہ اس زمانہ میں جب لوگ آپ کو قبیلہ سے نکال دیں گے میں زندہ رہوں۔ یہ الفاظ ورقہ نے پیغمبر اسلام سے ۶۱۰ء میں کہے تھے۔ اس کی یہ پیشین گوئی ۶۱۶ء میں واقعہ بن کر سامنے آگئی۔

اوپر کا فقرہ کونستان ورژیل جارج (رومانوی مستشرق) کی کتاب "پیغمبر اسلام" سے ماخوذ ہے۔ تمام پیغمبروں میں یہ صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ آپ کی زندگی کے ہر واقعہ کو سن اور تاریخ کی زبان میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ آپ کی زندگی تاریخ کا ایک صفحہ ہے نہ کہ محض روایاتی کہانیوں کا مجموعہ۔

یہ بات بظاہر سادہ سی ہے مگر وہ بے حد عجیب ہے۔ کیوں کہ پیغمبر اسلام کے سوا جتنے بھی دوسرے پیغمبر اس دنیا میں آئے، ان سب کا معاملہ یہ ہے کہ خالص علمی اعتبار سے آج وہ اعتقادی شخصیت ہیں نہ کہ تاریخی شخصیت۔ ان کا ذکر صرف مقدس مذہبی کتابوں میں ملتا ہے، باقاعدہ تاریخ میں ان کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔

حضرت نوح کس تاریخ کو کشتی میں سوار ہوئے۔ حضرت ابرہیم نے کس تاریخ کو عراق چھوڑا۔ حضرت موسیٰ کو کب نبوت ملی۔ حضرت مسیح کس تاریخ کو پیدا ہوئے۔ یہ ساری باتیں خالص تاریخی معیار سے غیر معلوم ہیں۔ جب کہ پیغمبر اسلام کی زندگی کے تمام واقعات باقاعدہ تاریخ وار انداز میں ثابت اور معلوم ہیں۔

یہ صورت حال انسانیت کے لئے بہت بڑی رحمت ہے۔ اس کی وجہ سے اب انسان کے لئے انتخاب کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس کو اس آزمائش میں نہیں کھڑا ہونا ہے کہ اپنی ہدایت کے لئے بہت سے پیغمبروں میں سے ایک کا انتخاب کرے۔ وہ غیر ضروری تلاش کی زحمت میں پڑے بغیر اپنا ہاتھ پیغمبر آخر الزماں کے ہاتھ میں دے کر مطمئن ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے سچے رہبر کو پالیا۔

حقیقی عبادت

اسلامی عبادات شخصیت کی تعمیر کا ایک زندہ کورس ہیں۔ وہ محض رسم (rituals) کا کوئی جامد مجموعہ نہیں۔ تاہم ادائیگی کے اعتبار سے اسلامی عبادات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ عبادات کو خشوع (المؤمنون ۲) کی سطح پر ادا کیا جائے۔ اور دوسرا یہ کہ ان کو قساوت (الزمر ۲۲) کی سطح پر ادا کیا جارہا ہو۔ اسلامی عبادات کا مطلوب فائدہ صرف خشوع والی ادائگی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ قساوت والی ادائگی سے کبھی مطلوب فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

عبادات کو قساوت کی سطح پر ادا کرنا وہ ہے جب کہ ان کو محض جسم کی سطح پر ادا کیا جائے۔ آدمی کا فکری وجود اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔ اس کے برعکس ان عبادات کو خشوع کی سطح پر ادا کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کی زبان یا اس کے جسم کے اعضاء عبادات کے ظاہری افعال انجام دیں تو اسی کے ساتھ اس کی فکری ہستی بھی اس میں پوری طرح شامل ہو جائے۔

اس کی ادائیگی کلمہ محض حرکت لسان نہ ہو بلکہ وہ اس کے لئے ایک داخل القلب (الرعد ۲۸) واقعہ ہو۔ اس کا ذکر محض الفاظ کا ورد نہ ہو بلکہ اسی کے ساتھ اس کے شعور میں احساس خداوندی کا تہلکہ برپا ہو رہا ہو (الانفال ۲) اس کی نماز محض سہو کی نماز نہ ہو بلکہ وہ اس کے اندر ایسا خشوع پیدا کرے جب کہ اس کی فکری ہستی اور اس کی جسمانی ہستی دونوں مل کر ایک ہو گئے ہوں۔

آدمی اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک فکری ہستی ہے۔ وہ ایک سوچنے والی مخلوق ہے۔ آدمی خود اپنی فطرت کے اعتبار سے مجبور ہے کہ وہ سوچے۔ کوئی آدمی سوچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب جن لوگوں نے اسلامی عبادات کو محض رسوم (rituals) کی سطح پر پایا ہو اور اس بنا پر قساوت کی سطح پر عبادات ادا کرتے ہوں تو ان کی شخصیت دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک حصہ عبادتی روٹین کا ہوتا ہے جو ایک قسم کے ضمیمہ کے طور پر ان کی زندگی میں شامل رہتا ہے۔ دوسرا حصہ ان کی فکری زندگی کا ہوتا ہے جہاں ہر لمحہ ذہنی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ سچی عبادت وہ ہے جس میں انسان کا جسم اور اس کی روح دونوں عبادت گزار بن جائیں۔

مسائل کے باوجود

زندگی مسائل کے درمیان زندہ رہنے کا نام ہے۔ اس دنیا میں بے مسئلہ زندگی سرے سے ممکن ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں ہر آدمی کسی نہ کسی مسئلہ سے دوچار رہتا ہے۔ خواہ وہ دولت مند ہو یا غریب، خواہ وہ طاقت ور ہو یا کمزور، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل۔

مگر انسان کا مزاج مسئلہ سے گھری ہوئی زندگی کو پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ ہر آدمی مسلسل اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ جس مسئلہ میں مبتلا ہے اس کو ختم کردے تاکہ اس کو بے مسئلہ زندگی حاصل ہو جائے۔ مگر جب وہ سالہا سال کی کوشش کے بعد ایک مسئلہ کو ختم کر لیتا ہے تو عین اسی وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ نئے مسائل سے دوچار ہو گیا ہے۔ مزید یہ کہ یہ دوسرا مسئلہ پہلے مسئلہ سے بھی زیادہ سخت ہے۔

یہ ایک ایسی غلطی ہے جس میں تقریباً ہر آدمی مبتلا رہتا ہے۔ وہ ساری عمر بے مسئلہ زندگی کی تلاش میں رہتا ہے۔ مگر وہ کبھی اپنے مقصد کو نہیں پاتا۔ یہاں تک کہ وہ اسی حال میں دنیا سے چلا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی آدمی کے لئے انتخاب بامسئلہ زندگی اور بے مسئلہ زندگی کے درمیان نہیں ہے، بلکہ یہاں آدمی کو ایک قسم کے مسئلہ اور دوسرے قسم کے مسئلہ کے درمیان انتخاب کرنا ہے۔ اور جب ایک مسئلہ کو ختم کر کے دوسرا مسئلہ سامنے آنے والا ہو تو عقل مندی یہی ہے کہ آدمی اسی مسئلہ پر راضی ہو جائے جس میں ابتداءً وہ اپنے آپ کو مبتلا پا رہا تھا۔

موجودہ دنیا میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ آدمی مسائل کے باوجود اپنے لئے کام کے مواقع تلاش کرے۔ نہ کہ وہ مسائل کو ختم کرنے میں لگا رہے، یہاں تک کہ وہ اسی حال میں مر جائے۔

یہ ایک ایسی عام کمزوری ہے جس میں افراد بھی مبتلا رہتے ہیں اور قومیں اور جماعتیں بھی، اس دنیا میں فرد اور قوم دونوں کے لئے کامیابی کا واحد راز یہ ہے کہ وہ مسائل کے ساتھ جینا سیکھیں اور مسائل کے رہتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔

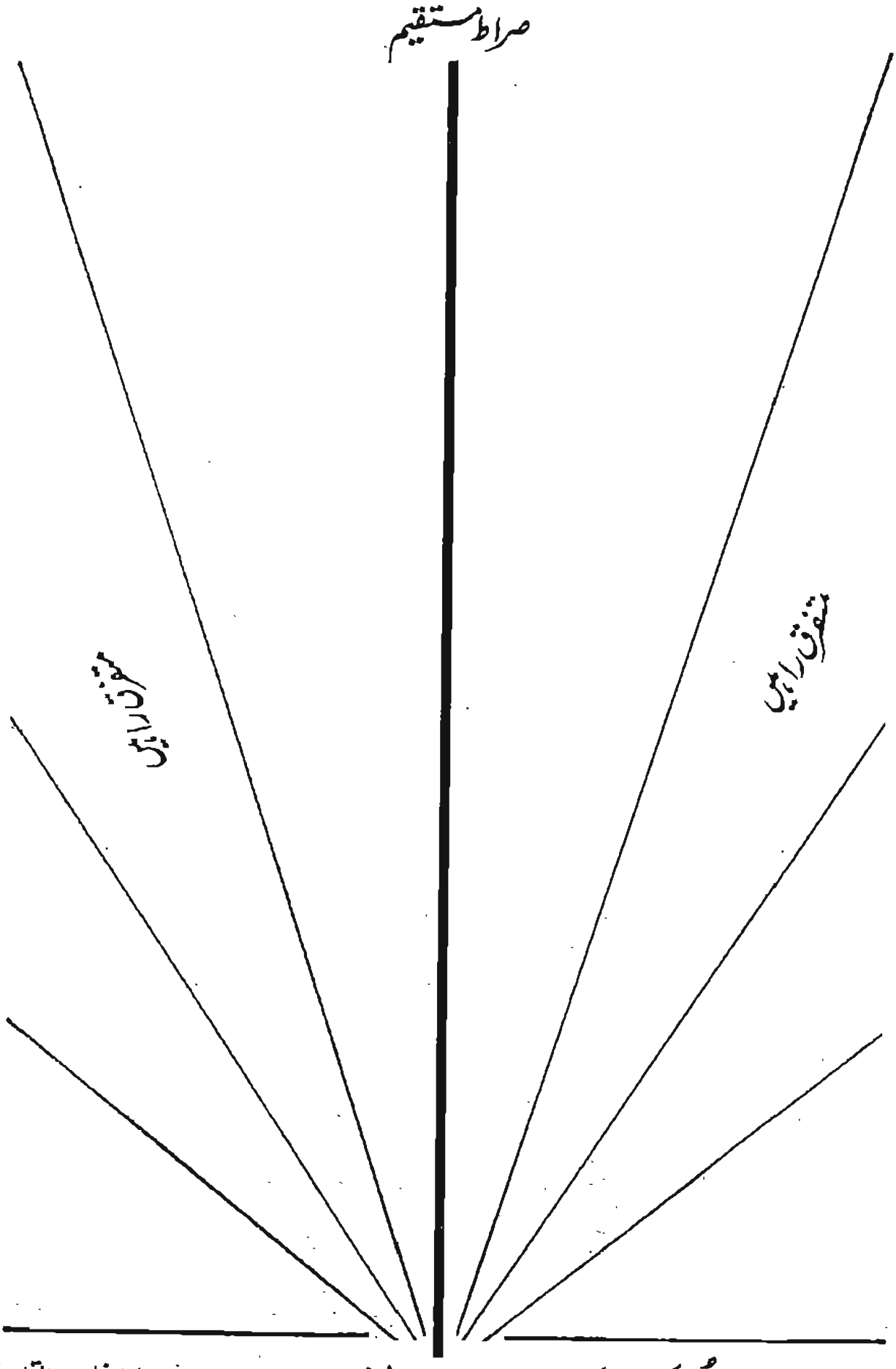

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (بے شک میرا رب ہے سیدھی راہ پر) یعنی جو سیدھی راہ چلے وہ اس سے ملے (شاہ عبدالقادر)

اقامت الدین، تفرق فی الدین

مسند احمد میں حضرت عبد اللہ بن مسعود کے حوالہ سے ایک حدیث آئی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: خط رسول الله ﷺ خطاً ثم قال هذا سبيل الله مستقيماً و خط عن يمينه وشماله ثم قال هذه السبل ليس منها سبيل الاعليه شيطان يدعوا إليه . ثم قرأ، وأن هذا صراطي مستقيماً فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله (تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ۲/۱۹۰) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے (زمین پر) ایک خط کھینچا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہ اللہ کا سیدھا راستہ ہے۔ پھر آپ نے اس سیدھے خط کے دائیں اور بائیں مزید خط کھینچے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہ متفرق راستے ہیں، ان میں سے ہر راستے پر ایک شیطان ہے جو اپنی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے۔ پھر آپ نے قرآن کی یہ آیت پڑھی: وأن هذا صراطي مستقيماً فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله (الانعام ۱۳۶)

اس روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حقیقت کو تمثیل کے روپ میں بتایا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، زندگی میں ایک شاہراہ (highway) ہوتی ہے جو ایک مقام سے دوسرے مقام تک سیدھی چلی جاتی ہے۔ جو آدمی اس سیدھی شاہراہ پر چلے وہ چلتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔ مگر جو شخص شاہراہ کے اطراف میں بکھرے ہوئے ذیلی راستوں میں چلے گا وہ شاہراہ کے دائیں اور بائیں بھٹک جائے گا، وہ اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ دین میں کچھ اساسی تعلیمات ہیں۔ اسی کے ساتھ دین کے کچھ جزئی اور فروعی مسئلے ہیں۔ جو آدمی اپنی ساری توجہ اساسی تعلیمات پر لگائے وہ آخر کار اللہ تک پہنچ جائے گا جو ہر مومن کی اصل منزل ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی اساسی تعلیمات کے معاملہ میں بے توجہی برتتا ہے اور فروعی اور جزئی مسائل میں مشغول ہو جائے، وہ دین کے اصل دھارے سے بھٹک جائے گا۔ وہ اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچے گا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ دین میں جو اصولی یا اساسی احکام ہیں بس وہی مطلوب ہیں، جزئی یا فروعی مسائل مطلوب نہیں۔ یہ مطلوبیت کے فرق کا معاملہ نہیں ہے بلکہ تاکید کے فرق کا معاملہ ہے۔ اس سے مراد وہی چیز ہے جس کو زور و تاکید میں تبدیلی (shift of emphasis) کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایمان کے معاملہ میں اصل چیز ذاتی معرفت ہے۔ اب اگر معرفت کے بجائے گروہی نسبت پر زور دیا جانے لگے تو عارفانہ ایمان ختم ہو کر صرف آبائی ایمان باقی رہے گا۔ اسی طرح عبادت کے معاملہ میں اصل چیز خشوع ہے۔ اب اگر ساری بحث خارجی قسم کے جزئی مسائل پر ہونے لگے تو عبادت کا عمل قلبی خشوع کا ایک عمل نہ رہے گا بلکہ ظاہری اور جسمانی آداب کا ایک عمل بن کر رہ جائے گا۔ اسی طرح قرآن سے تعلق کی اصل اس کی آیتوں میں تدبر کرنا اور اس سے نصیحت حاصل کرنا ہے۔ اب اگر سارا زور اس کے الفاظ کی فنی ادائیگی پر دیا جانے لگے تو قرآن نصیحت کی کتاب نہ ہو کر صرف لفظی تلاوت کی کتاب بن جائے گا۔ اسلامی احکام کے سلسلہ میں اصل اہمیت ذاتی اتباع کی ہے۔ اب اگر ساری تقریر و تحریر کا موضوع یہ بن جائے کہ ان احکام کو دوسروں کے اوپر نافذ کرو تو اسلامی احکام ذاتی اتباع کا موضوع نہ رہ کر خارجی نفاذ کا موضوع بن جائیں گے اور پھر اس کے نتیجہ میں جو چیز ظہور میں آئے گی وہ اسلام کی تعمیل نہ ہوگی بلکہ اسلام کے نام پر بے فائدہ ہنگامہ آرائی اور تخریب کاری ہوگی، وغیرہ۔

رخ سے بے رخ ہونا

ہر کام کے کرنے کا ایک صحیح رخ ہوتا ہے اور ایک غلط رخ۔ آدمی صحیح رخ پر چل کر منزل پر پہنچتا ہے اور غلط رخ پر چل کر اِدھر اُدھر بھٹک جاتا ہے۔ مثلاً تجارت میں کامیابی کا راز محنت اور دیانت داری ہے۔ اب تاجر کے لئے عمل کا صحیح رخ یہ ہوگا کہ وہ محنت اور دیانت کا ثبوت دے کر تجارتی کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ تاجر کا صحیح تجارتی رخ پر چلنا ہے۔ اور جو شخص صحیح رخ پر چلے وہ ضرور ایک نہ ایک دن کامیاب ہوگا۔ اس کے برعکس اگر وہ یہ کرے کہ بازار کے دوسرے تاجروں کی بربادی پر اپنی تجارتی ترقی کی بنیاد رکھنا چاہے، یا بینکوں میں ڈاکہ ڈال

کر آناً فاناً کروڑ پتی بننے کا خواب دیکھے، یا تجارت کے نام پر جلسہ جلوس اور احتجاج اور مطالبہ کی مہم چلائے اور سمجھے کہ اس طرح وہ اپنی تجارتی منزل پر پہنچ جائے گا تو یہ سب اس کے لئے غلط رخ پر بھٹکنے کی صورتیں ہوں گی۔ ایسا تاجر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام صورتیں کسی تاجر کے لئے رخ سے بے رخ ہونے کی صورتیں ہیں اور جو شخص رخ سے بے رخ ہو جائے اس کے لئے اس دنیا میں کوئی کامیابی نہیں۔

یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ دین کی بھی ایک صراط مستقیم ہے اور ایک اس میں بھٹکنے کے راستے ہیں۔ صراط مستقیم پر چلنے کو قرآن میں اقامت دین کہا گیا ہے اور اِدھر اُدھر کے راستوں میں بھٹکنے کو تفرق فی الدین (شوریٰ ۱۳)۔

دین کی صراط مستقیم پر قائم ہونا یہ ہے کہ آدمی ایک اللہ کو اپنا سب کچھ بنائے، وہ اسی سے سب سے زیادہ ڈرے، وہ اسی سے سب سے زیادہ محبت کرے۔ اس کو سب سے زیادہ فکر آخرت کی ہو۔ وہ ہر معاملہ کو آخرت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہو کہ وہ جہنم کے عذاب سے بچ جائے اور اس کی سب سے بڑی طلب یہ ہو کہ خدا اس کو جنت میں داخل کرے۔ وہ دنیا میں ذمہ دارانہ زندگی گزارے۔ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اس کا رویہ احتیاط اور تقویٰ کا رویہ ہو نہ کہ آزادی اور بے قیدی کا رویہ۔ یہ دین کا سیدھا راستہ ہے۔ جو اس پر چلے گا وہ لازماً خدا کو پالے گا۔ وہ اس کی رحمت و نصرت میں حصہ دار بنایا جائے گا۔ سیدھا راستہ ہی آدمی کو منزل تک پہنچاتا ہے۔

اس کے برعکس دین میں متفرق ہونا یہ ہے کہ دین کا کوئی لفظ بول کر ایک غیر متعلق قسم کی دھوم مچائی جائے۔ مثلاً توحید کا نام لے کر اس قسم کی بحثیں شروع کر دی جائیں کہ خدا کا ایک جسمانی وجود ہے یا ایک روحانی وجود۔ وہ صرف عادل ہے یا ظلم پر بھی قادر ہے، وغیرہ۔ یا عبادت کا نام لے کر فضائل عبادت کی طلسماتی کہانیاں سنائی جانے لگیں یا مسائل عبادت میں فنی موشگافیاں کر کے نئی نئی لامتناہی بحثوں کا آغاز کر دیا جائے۔ کوئی اسلام کے نظام عدل کو قائم کرنے کے نام پر

"ظالم حکمرانوں" کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے اکھیڑ پچھاڑ شروع کر دے۔ کوئی یہ نظر بنائے کہ اسلام ایک مکمل نظام ہے۔ اور مکمل نظام سیاسی اقتدار کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا لئے سب سے پہلا کام حکومت پر قبضہ کرنا ہے۔ یہ کہہ کر وہ سارے دین کو سیاست بازی کے پر چلادے۔

اس قسم کی تمام صورتیں دین کی صراط مستقیم سے بھٹکنے کی صورتیں ہیں۔ وہ قرآن الفاظ میں تفرق فی الدین ہے نہ کہ اقامت دین (شوریٰ ۱۳)۔ یہ ٹیڑھے راستے ہیں، اور ٹیڑ راستہ پر چلنے والا آدمی قرآن کے الفاظ میں کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچتا۔

مسلمانوں کے درمیان اسلام کے نام سے کوئی سرگرمی جاری ہو تو اس کے اسلامی ہونے کے لئے یہی کافی نہیں کہ اس کے علم بردار اسلام کا نام لے رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ ضرور ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ یہ لوگ اسلام کی صراط مستقیم پر چل رہے ہیں یا ٹیڑھے اور تنگ راستو میں دوڑ رہے ہیں۔ حتی کہ کوئی تحریک "اقامت دین" کے نام پر اٹھے تب بھی یہ ممکن ہے کہ وہ بظاہر اقامت دین کا نام لے، مگر حقیقۃً اس کی سرگرمیاں تفرق فی الدین کے خانہ میں جانے والی ہوں۔

انتہائی ضروری ہے کہ اسلام کا نہایت گہرا مطالعہ کیا جائے تاکہ آدمی تفرق فی الدین سے بچے، اور حقیقی معنوں میں دین کو اپنی زندگی میں اختیار کرنے والا بنے۔

اقامت دین اور تفرق فی الدین

شرع لکم من الدین ما وصی به	اللہ نے تمہارے لئے دین سے وہی چیز مقرر کی جس کا
نوحا والذی اوحینا الیك وما	اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی وحی ہم نے
وصینا به ابراهیم و موسیٰ	تمہاری طرف کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور
وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا	موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ قائم رکھو دین کو اور اس میں
تتفرقوا فیه کبر علی المشرکین	متفرق نہ ہو۔ مشرکین کو وہ بات بہت گراں گزرتی

ما تدعوهم الیه اللہ یجتبی الیہ من یشاء ویهدی الیہ من ینیب (شوریٰ ۱۳)

ہے جس کی طرف تم ان کو بلاتے ہو۔ اللہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور وہ اپنی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔

اقامت کے معنیٰ ہیں سیدھا کرنا۔ قرآن میں یہی لفظ جھکی ہوئی دیوار کو سیدھا کر دینے کے معنیٰ میں آیا ہے (کہف ۷۷) تفرق کا لفظ تجمع کی ضد ہے۔ اس کا مطلب ہے جدا ہونا۔ قرآن میں یہ لفظ ایسے موقع پر استعمال ہوا ہے جب کہ آدمی اصل شاہراہ کو چھوڑ کر کنارے کے ذیلی راستوں میں بھٹک جائے (انعام ۱۵۳) آیت میں الدین سے مراد توحید اور صرف ایک خدا کی عبادت کرنا ہے۔ یہی وہ دین ہے جو تمام نبیوں کو دیا گیا (وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون ، (انبیاء ۲۵) مطلب یہ ہے کہ خدا نے تمام نبیوں کو ایک ہی دین دیا تھا اور وہ توحید کا دین تھا نہ کہ شرک کا دین۔ اس لئے تم اسی دین توحید پر پوری طرح قائم رہو، اس میں شاخیں نکال کر اپنی توجہات کو ادھر اُدھر نہ پھیرو۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں جو حکم ہے وہ اقامت بمقابلہ عدم اقامت نہیں ہے بلکہ اقامت بمقابلہ تفرق ہے۔ یعنی مطلق طور پر یہ نہیں کہا گیا ہے کہ دین کو قائم کرو اور دین کو قائم کئے بغیر نہ رہو۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ "الدین" کو قائم کرو اور "الدین" میں تفرق نہ کرو۔ مطلب یہ ہوا کہ خدا نے جو الدین (اصل دین) اتارا ہے صرف اسی کی اقامت اور پیروی میں لگو، ایسا مت کرو کہ اس اصل دین میں دوسرے دوسرے راستے نکال کر اس میں متفرق ہو جاؤ۔ تمہاری توجہ اصل دین پر لگے نہ کہ متفرق پہلوؤں میں بکھر جائے۔

رمضان کے مہینہ کی ایک شام کو جب کہ راقم الحروف بھوک پیاس سے نڈھال ہو رہا تھا۔ میری زبان سے نکلا: کھانا بھی خدا کی کیسی عجیب نعمت ہے، ایک دن بھی نہ ملے تو آدمی کا برا حال ہو جاتا ہے" یہ سن کر ایک صاحب نے کہا: آج کل لوگ کمزور ہو گئے ہیں۔ ورنہ پہلے زمانہ میں ایک دن کیا چار دن لوگ بھوکے پیاسے رہ جاتے تھے۔ میں نے کہا ہاں، مگر وہ بھی مستقل

بھوکے نہیں رہ سکتے تھے۔ اس واقعہ میں مذکورہ بزرگ کا جملہ اصل بات سے تفرق کی ایک مثال ہے۔ کہنے والے کا منشا اصلاً کھانے کی اہمیت پر زور دینا تھا۔ "ایک دن" کا لفظ اس میں محض اضافی تھا۔ مگر سننے والے نے اسی لفظ کو لے لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بات اپنے رخ سے ہٹ کر غیر متعلق پہلو کی طرف مڑ گئی۔ موصوف اگر کھانے کی "نعمت" کے پہلو کو ابھارتے تو یہ کہی ہوئی بات کی اقامت ہوتی۔ جب انھوں نے "ایک دن" کے پہلو کو لے کر اس پر تقریر شروع کر دی تو انہوں نے گویا اصل بات سے تفرق کیا۔ وہ شاہراہ کلام سے جدا ہو گئے۔

اب ایک اور مثال لیجئے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان تمام ملکوں میں کسی نہ کسی طاقت کے ظلم کا شکار ہو رہے ہیں۔ کہیں کسی اقتصادی طاقت کا، کہیں کسی اکثریتی طاقت کا، کہیں کسی سیاسی اور فوجی طاقت کا۔ اس مسئلہ کا حقیقی حل صرف اعداد قوت (انفال ۶۰) ہے۔ یعنی مسلمانوں کا طاقت ور ہونا۔ ظلم و زیادتی ہمیشہ بے طاقتی کی سزا ہوتی ہے اور اپنے آپ کو طاقت ور بنا کر ہی اس سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ طاقت ور بنانے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو علم و شعور سے آراستہ کیا جائے، ان میں باہمی اتحاد پیدا کیا جائے، ان کو جدید فکری اور عملی قوتوں سے مسلح کیا جائے۔ ان پہلوؤں سے تیار ہونے کا نام طاقت ور ہونا ہے اور جو قوم ان چیزوں میں طاقتور ہو جائے اس کے اوپر کوئی ظالم، ظلم کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

اس کے برعکس دوسرا طریقہ یہ ہے کہ احتجاج اور مطالبات کا لفظی طوفان برپا کیا جائے۔ جلسے جلوس کی دھوم مچائی جائے۔ تقریروں اور تجویزوں کا سیلاب بہایا جائے۔ مگر اس قسم کی تمام چیزیں محض وقتی ہنگامے ہیں جن کا کوئی بھی حقیقی فائدہ قوم کو ملنے والا نہیں۔ ان دونوں طریقوں میں سے پہلا طریقہ ملت کی اقامت کا طریقہ ہے اور دوسرا طریقہ ملت کے مسئلہ سے تفرق کا طریقہ۔ پہلا کام اصل کام ہے جب کہ دوسرا کام اصل کام کی نسبت سے غیر متعلق کام، وہ اپنے انجام کے اعتبار سے ملت کے محاذ سے متفرق ہونا ہے نہ کہ ملت کے محاذ پر جد و جہد کرنا۔

ان مثالوں سے اقامت دین اور تفرق فی الدین کا مطلب سمجھا جا سکتا ہے۔ مذکورہ آیت میں

"الدین" سے مراد وہ اصل دین ہے جو تمام نبیوں پر اترا۔ یعنی توحید۔ توحید سے مراد ہے ــــ اللہ کو تنہا خالق اور مالک اور معبود جاننا، اسی پر بھروسہ کرنا، اسی سے ڈرنا اور اسی سے محبت کرنا، اپنے تمام بہترین جذبات کو اسی کی طرف متوجہ کر دینا۔ اپنا سب کچھ صرف اللہ کو بنا لینا۔ اللہ سے یہ وابستگی جب کسی کے اندر حقیقی معنوں میں پیدا ہوتی ہے تو وہی آدمی کی زندگی بن جاتی ہے۔ وہ اس کی پوری زندگی کو کچھ سے کچھ کر دیتی ہے۔ آدمی کا سوچنا، اس کا بولنا، اس کا عمل کرنا، اس کا لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنا، اس کا مختلف حالات میں ردعمل ظاہر کرنا، سب اسی کے تابع ہو جاتے ہیں۔ آدمی اندر سے باہر تک پوری طرح خدا کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ الدین (توحید) کو اس طرح اپنے اندر سمونے کا نام اقامت دین ہے۔ یہ اقامت دین اولاً فرد کے اپنے اندر متحقق ہوتا ہے اور اس کے بعد حسب حالات وہ اجتماعی زندگی میں ظاہر ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں تفرق فی الدین یہ ہے کہ اصل دین کے ارد گرد غیر متعلق بحثیں نکال کر اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا جائے۔ مثلاً اسلامی عقائد میں خود ساختہ کلامی بحثیں چھیڑنا، اسلامی عبادات میں بطور خود مسائل وضع کر کے فقہی جھگڑے کھڑے کرنا۔ اسلامی کیفیات پیدا کرنے کے نام پر نئی نئی "روحانی" ورزشیں تجویز کرنا۔ اور لوگوں میں اس کو رواج دینا۔ اسی طرح یہ بھی تفرق فی الدین ہے کہ "توحید" کے علاوہ دوسری دوسری چیزوں کو عنوان بنا کر تحریکیں چلائی جائیں۔ مثلاً خدائی حکومت قائم کرنے کے نام پر، اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے نام پر، خیر الامم کو اس کے مقام بلند کی طرف لے جانے کے نام پر، فساد فی الارض اور طاغوتی نظام کو ختم کرنے کے نام پر، وغیرہ۔ اقامت دین حقیقی معنوں میں موحد بننے کا نام ہے اور تفرق فی الدین دین کے نام پر دوسری چیزوں میں متفرق ہونے کا۔ قدیم حاملین شریعت اسی قسم کے تفرق میں مبتلا ہو گئے تھے، چنانچہ ان کے بارہ میں کہا گیا:

وما تفرق الذین اوتوا الکتاب الا من بعد ما جائتهم البینة . وما امروا الا لیعبدوا الله — اور اہل کتاب واضح دلیل آنے کے بعد بھی دین میں متفرق ہو گئے۔ حالاں کہ ان کو یہی حکم ہوا تھا

مخلصين له الدين حنفاء ويقيموا الصلوة ويوتوا الزكوة و ذلك دين القيمة (البینہ)

کہ وہ اللہ کی عبادت کریں دین کو اس کے لئے خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں اور یہی ہے درست دین۔

دین اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی قسم کے خارجی ہنگامے کا نام نہیں ہے بلکہ اللہ کی دنیا میں بسیرا لینے کا نام ہے۔ دین دار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی فطرت کی اس سطح پر جینے لگے جس سطح پر خدا کی دوسری مخلوقات جی رہی ہیں۔ اس کا شعور اللہ سے مل جائے۔ اس کی یادوں میں اللہ بسا ہوا ہو۔ اس کے پر شوق جذبات کا مرکز صرف اللہ بن جائے۔ جب کوئی شخص خدا کو اس طرح پاتا ہے تو وہی اس کا مطلوب و مقصود بن جاتا ہے۔ اس کی سرگرمیوں کا رخ تمام تر خدا کی طرف ہو جاتا ہے۔ اخلاق و معاملات میں وہ وہی کرنے لگتا ہے جو اس کا خدا اس سے چاہتا ہے، حتیٰ کہ اس وقت بھی جبکہ اپنے جذبات اور اپنی مصلحتوں کو اس کی خاطر قربان کر دینا پڑے۔

قرآن میں یہود و نصاریٰ کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور ان کو نعمت بھری جنتوں میں داخل کرتے۔ اور اگر وہ قائم کرتے تورات اور انجیل کو اور جو ان کی طرف ان کے رب کے پاس سے اترا تو وہ کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے، ان میں کچھ لوگ سیدھی راہ پر ہیں اور بہت سے ان میں برے کام کر رہے ہیں (مائدہ ۶۵۔۶۶) اس آیت میں ایمان و تقویٰ اور تورات و انجیل کی اقامت دونوں کو ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے لئے آسمانی کتاب کی اقامت کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایمان لائیں اور تقویٰ کی زندگی اختیار کریں۔ یہی سورہ شوریٰ میں اقامت دین کا مطلب بھی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی حقیقی معنوں میں اللہ کا مومن بن جائے۔ وہ دنیا کی زندگی میں اس سے ڈرنے لگے۔ صرف ایک اللہ اس کے ذہن کا اثاثہ اور اس کے قلب کا سرمایہ ہو۔ اس کا اللہ سے تعلق اتنا گہرا اور اتنا زندہ ہو کہ وہ اس کے اوپر مستقل نگراں بن جائے۔ پر سکون حالات ہوں یا جذباتی ہیجان کا وقت ہو، ہر حال میں وہ اللہ سے

ڈرے اور ہر معاملہ میں وہ اس کی مرضی کا پابند رہے۔

اقامت دین اصلاً انفرادی طور پر اللہ کے دین پر قائم ہونے کا نام ہے۔ مگر جب بہت سے افراد اللہ کے دین پر قائم ہو جائیں تو حالات کے بقدر اس کے اجتماعی نتائج بھی ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں، ٹھیک ویسے ہی جیسے ایک درخت ہو تو وہ صرف ایک درخت ہے اور بہت سے درخت ہوں تو ان کے مجموعہ سے ایک باغ وجود میں آجاتا ہے۔ تاہم اجتماعی چیزیں اقامت دین کا بالواسطہ نتیجہ ہیں نہ کہ اس کا براہ راست نشانہ۔

تفرق فی الدین کا مطلب دین سے الگ ہونا نہیں ہے بلکہ دین کی شاہراہ سے الگ ہونا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے قرآن کی ایک آیت پر غور کیجئے۔ قرآن کی سورہ نمبر ۶ میں ارشاد ہوا ہے:

"کہو، آؤ میں تم کو سناؤں وہ چیزیں جو تم پر تمہارے رب نے حرام کی ہیں۔ یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تم کو بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ اور بے شرمی کی باتوں کے قریب نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی۔ اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔ یہ باتیں ہیں جن کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھ سے کام لو۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریق پر جو بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی پختگی کو پہنچ جائے۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم کسی شخص پر اس کے تحمل سے زیادہ بوجھ نہیں رکھتے۔ اور جب بات کہو تو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار کا کیوں نہ ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ ان باتوں کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے تاکہ نصیحت پکڑو۔ اور یہی میرا سیدھا راستہ ہے پس تم اسی پر چلو اور دوسری راہوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے جدا کر دیں گی۔ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم بچو۔" (الانعام ۱۵۲۔ ۱۵۳)

اس سے معلوم ہوا کہ دین کی ایک شاہراہ ہے اور اس کے دائیں بائیں بہت سی پگڈنڈیاں نکلتی ہیں۔ مومن وہ ہے جو شاہراہ پر چلے اور ادھر اُدھر کی پگڈنڈیوں میں نہ کھو جائے۔ دین کی شاہراہ یہ ہے کہ آدمی صرف ایک خدا سے اپنا تعلق جوڑے، خدا کی خدائی میں کسی اور کو شامل نہ

کرے۔ یہی توحید ہے۔ یہ توحید جب کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کے اندر ایک نیا شعور ابھر آتا ہے۔ وہ اللہ سے ڈرتا ہے اور اسی پر سب سے زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔ اس کا خوفِ خدا اور اس کا اعتماد علی اللہ اس کی زندگی میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے والدین اور یتیموں اور عام انسانوں کے بارے میں حد درجہ محتاط انسان بن جاتا ہے۔ رزق کے معاملہ میں وہ اپنے کو پوری طرح حلال دائرہ میں محدود رکھتا ہے۔ بے ہودہ کام کرنا اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ کسی کو دینا ہو یا کسی سے لینا ہو ہر حال میں وہ انصاف پر قائم رہتا ہے۔ اس کی زبان کھلتی ہے تو سچائی کے لئے کھلتی ہے نہ کہ بیجا حمایت یا بیجا مخالفت کے لئے۔ اس کا تعلق باللہ اس کے اور خدا کے درمیان ایک خاموش عہد بن جاتا ہے جس کو وہ کبھی نہ توڑے خواہ اس کے لئے اس کو اپنے آپ پر کتنا ہی جبر کرنا پڑے۔

یہ دین کی شاہراہ پر قائم ہونا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دین کی شاہراہ سے جدا ہونا یہ ہے کہ آدمی مذکورہ چیزوں میں نئی نئی شاخیں نکال کر ان کی دینی اہمیت ثابت کرے اور ان کی طرف دوڑنا شروع کر دے۔ مثلاً اس کا دل اللہ کی کبریائی کے جذبہ سے سرشار نہ ہو البتہ "کچھ رجال" اور "کچھ شخصیتوں" کے ساتھ والہانہ عقیدت کا اظہار اس کا محبوب مشغلہ بنا ہوا ہو۔ تنہائیوں میں اللہ کے ڈر سے اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے نہ ہوتے ہوں البتہ "لاؤڈ اسپیکر" کی سطح پر وہ خوب اللہ کے نام کی دھوم مچاتا ہو۔ عبادات میں انابت و تضرع پیدا کرنے کا دھیان اس کو نہ ہو البتہ مسائل عبادت میں طرح طرح کی موشگافیاں پیدا کرنے کا وہ ماہر بنا ہوا ہو۔ وہ اپنے صاحب معاملہ کے ساتھ انصاف نہ کرے البتہ خارجی دنیا میں عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہو۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہ ہو البتہ دوسروں کے ظلم و بربریت کا اعلان کرنے میں وہ سب سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہو۔

وہ اپنے پڑوسی کی مدد نہ کرے البتہ دور کے مسائل پر تقریر کرنے سے اس کی زبان کبھی نہ تھکتی ہو۔ اس کا دل اللہ کی یاد سے خالی ہو البتہ ذکر کے نام پر الفاظ کی تکرار کرنے میں لاکھوں کا عدد

بھی اس کے لئے ناکافی ثابت ہو رہا ہو۔ اپنی نماز میں خشوع پیدا کرنے کی اسے فکر نہ ہو۔ البتہ مسجدوں کی آرائش وزیبائش کا وہ خوب اہتمام کرتا ہو۔ اپنے کمزور دینی بھائی کے حقوق اس کو یاد نہ آئیں البتہ بڑی بڑی شخصیتوں کے ساتھ اسلامی اخوت کا مظاہرہ کرنا وہ کبھی نہ بھولتا ہو۔ اپنے نفس کو خدا کے آگے جھکانے کا اسے شوق نہ ہو البتہ ساری دنیا کو خدا کے آگے جھکانے کا وہ مجاہد بنا ہوا ہو۔ اس قسم کی تمام صورتیں تفرق فی الدین کی صورتیں ہیں۔ ان کو خواہ جس نام پر بھی کیا جائے اور ان کے ساتھ کیسی ہی خوش فہمیاں وابستہ کی جائیں وہ خدا کے یہاں مقبول دین کی حیثیت سے لکھی نہیں جا سکتیں۔

دین کے راستہ سے متفرق ہونا ایسا ہی ہے جیسے ٹرین کا اپنی پٹری سے اتر جانا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی تجدید ایمان کے نام پر اٹھے اور پھر کلمہ کی تصحیح اور اس کے طلسماتی خواص پر پوری تحریک چلا دے۔ وہ اسلام کو سربلند کرنے کا مدعی ہو اور پھر سیاسی کارروائیوں اور احتجاجی جلسوں کے رخ پر دوڑ پڑے۔ وہ دینی تعلیم کو اپنا مقصد بتائے اور پھر گروہی نزاعات اور تعصبات میں قوم کو الجھا دے۔ وہ احیائے ملت کا اعلان کرے اور پھر تقریر اور بیانات کے لفظی مشغلہ میں مصروف ہو جائے۔

آدمی جس طرح اقامتِ دین کے عمل میں دین کا نام لیتا ہے، اسی طرح وہ تفرق فی الدین کے عمل میں بھی دین ہی کا نام لیتا ہے۔ دونوں ہی قسم کی سرگرمیاں دین کے نام پر چلتی ہیں۔ مگر ایک اللہ کے یہاں مطلوب ہے اور دوسری اللہ کے یہاں غیر مطلوب۔ ایک سرگرمی سے آدمی کو اللہ کی رضا ملتی ہے اور دوسری سے آدمی اللہ کی ناراضگی کا مستحق بن جاتا ہے۔

اقامت دین کے بارے میں کچھ وضاحتیں

قرآن کی سورہ نمبر ۴۲ میں ارشاد ہوا ہے کہ جو دین اللہ نے دوسرے نبیوں کو دیا تھا وہی دین تم کو بھی دیا گیا ہے۔ اس دین کو قائم رکھو، اس میں متفرق نہ ہو (الشوریٰ ۱۳) اس آیت کی تفسیر تمام مفسرین یہ کرتے ہیں کہ اس میں دین کے وہ اساسی احکام مراد ہیں جو تمام نبیوں کے یہاں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ اس میں شرائع اور منہاج مراد نہیں ہیں۔ کیوں کہ قرآن کی

صراحت کے مطابق ان میں مختلف نبیوں کے درمیان فرق پایا جاتا ہے (المائدہ ۴۸)۔ شرائع اور منہاج جب مختلف ہوں تو ان کی متحدہ پیروی ممکن نہیں، متحدہ تعلیمات ہی کی متحدہ پیروی کی جاسکتی ہے۔ اس لئے اس آیت میں حکم اقامت کا اطلاق اساسی تعلیمات پر ہوگا نہ کہ تفصیلی تعلیمات پر۔ اس آیت کا منشا یہ ہے کہ تفصیلی احکام میں توسع اور حالات کی رعایت کا طریقہ اختیار کیا جائے اور مستقل زور اور تاکید صرف متفق علیہ باتوں پر دیا جائے۔ اس طرح ملت کے اندر حقیقی دینی فضا پیدا ہوگی۔ دین کے وہ ذیلی یا تفصیلی امور جن میں زمانہ اور حالات کے اعتبار سے فرق ہوتا رہتا ہے، ان کو اگر مستقل تاکید کی بنیاد بنایا گیا تو ملت کے اندر تفریق وانتشار ظہور میں آئے گا اور دین کے نام پر ایک ایسی فضا پیدا ہوگی جو عملاً دین کے لئے قاتل کی حیثیت رکھتی ہے (تفصیل کے لئے: تعبیر کی غلطی، الاسلام)

موجودہ زمانہ میں کچھ لوگوں نے اس آیت کی یہ تفسیر کی کہ اقامت دین کے حکم کا مطلب یہ ہے کہ سارے اسلامی قوانین کو بحیثیت ایک مکمل نظام کے جاری ونافذ کیا جائے۔ اب چونکہ مکمل قانون کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ حکومتی ادارہ تھا، اس تفسیر کے مطابق اقامت دین کا پہلا کام یہ قرار پایا کہ حکومت وقت سے تصادم کر کے اس سے اقتدار چھینا جائے تاکہ مکمل قانون کو نافذ کیا جاسکے۔ مسلم اقلیت کے ملکوں میں اس قسم کے سیاسی جہاد کے مواقع نہیں تھے اس لئے یہاں یہ تفسیر تقریری اور تحریری مہم تک محدود رہی۔ مسلم اکثریت کے ممالک جہاں مواقع کھلے ہوئے تھے، وہاں ان نے قائم شدہ مسلم حکومت کے خلاف براہ راست اقدام کی صورت اختیار کی۔ اس کے نتیجہ میں نہ صرف حرث ونسل کی ہلاکت اور باہمی فساد وجود میں آیا بلکہ اقامت دین کے نام پر یہ عظیم نقصان ہوا کہ ملت کے اندر دینی اتحاد کی وہ فضا بالکل برباد ہوگئی جو اقامت دین کے حکم کا مقصود اصلی تھا۔ اقامت دین کی تحریک کے یہ برعکس نتائج کافی تھے کہ اس کے علمبردار اپنے فکر پر نظر ثانی کریں۔ مگر انہوں نے یہ کیا کہ قرآن کی نئی نئی تفسیریں لکھ کر اپنے پیروؤں کے ذہن کو مزید پختہ کرنے کی کوشش کی۔ یہاں ہم اس سلسلہ میں

ایک تفسیر میں شائع شدہ بحث کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ مذکورہ مفسر قرآن کی سورۂ شوریٰ کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں:

"بعض لوگوں نے دیکھا کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ تمام انبیاء علیہم السلام کے درمیان مشترک ہے اور شریعتیں ان سب کی مختلف رہی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: لکل جعلنا منکم شرعة ومنهاجا، اس لئے انہوں نے یہ رائے قائم کرلی کہ لامحالہ اس دین سے مراد شرعی احکام وضوابط نہیں ہیں بلکہ صرف توحید و آخرت اور کتاب و نبوت کا ماننا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت بجالانا ہے۔ یا حد سے حد اس میں وہ موٹے موٹے اخلاقی اصول شامل ہیں جو سب شریعتوں میں مشترک رہے ہیں۔ لیکن یہ بڑی سطحی رائے ہے جو محض سرسری نگاہ سے دین کی وحدت اور شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر قائم کرلی گئی ہے اور یہ ایسی خطرناک رائے ہے کہ اگر اس کی اصلاح نہ کردی جائے تو آگے بڑھ کر بات دین و شریعت کی اس تفریق تک جا پہنچے گی جس میں مبتلا ہو کر سینٹ پال نے دین بلا شریعت کا نظریہ پیش کیا اور سیدنا مسیح علیہ اسلام کی امت کو خراب کردیا۔ اس لئے کہ جب شریعت دین سے الگ ایک چیز ہے اور حکم صرف دین کو قائم کرنے کا ہے نہ کہ شریعت کو، تو لامحالہ مسلمان بھی عیسائیوں کی طرح شریعت کو غیر اہم اور اس کی اقامت کو غیر مقصود بالذات سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے اور صرف ایمانیات اور موٹے موٹے اخلاقی اصولوں کو لے کر بیٹھ جائیں گے۔ اس طرح کے قیاسات سے دین کا مفہوم متعین کرنے کے بجائے آخر کیوں نہ ہم خود اللہ کی کتاب سے پوچھ لیں کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم یہاں دیا گیا ہے، آیا اس سے مراد صرف ایمانیات اور چند بڑے بڑے اخلاقی اصول ہی ہیں یا شرعی احکام بھی"۔

اس کے بعد موصوف نے مختلف آیتیں نقل کر کے دکھایا ہے کہ قرآن میں دین کا لفظ ایمانیات کے علاوہ قوانین واحکام کے لئے بھی آیا ہے۔ اس لئے لازماً تمام احکام کو دین میں شمار ہونا

چاہئے اور ان سب کو بروئے کار لانے کا نام اقامت دین ہونا چاہئے۔ ۴۸۸۔۴۹۰

۱۔ مذکورہ بالا اقتباس میں "بعض" کا لفظ معاملہ کی سنگینی کو گھٹا رہا ہے۔ کیوں کہ یہ رائے صرف "بعض مفسرین" کی نہیں ہے بلکہ بلا استثناء تمام قابل ذکر مفسرین کی ہے۔

۲۔ مذکورہ رائے کو سطحی اور سرسری قرار دینے کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ جب حکم کے الفاظ یہ ہیں کہ "تمام نبیوں کے دین کی پیروی کرو، اس میں متفرق نہ ہو" تو لامحالہ قرآن کی اس خاص آیت میں الدین سے دین کا مشترک حصہ مراد لینا ہوگا نہ کہ متفرق حصہ۔

۳۔ اقیموا الصلوۃ کی آیت میں کوئی شخص اقیموا الزکوۃ کو شامل نہ سمجھے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حکم زکوۃ کا انکار کر رہا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ زکوۃ کا حکم دوسری آیت میں ہے نہ کہ اقیموا الصلوۃ کی آیت میں۔ اسی طرح اقیموا الدین میں شرائع کو مراد نہ لینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شرائع سرے سے مطلوب نہیں ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اس آیت میں شامل نہیں ہیں۔ ان کا حکم دوسری آیتوں سے نکلتا ہے اور وہاں جو الفاظ ہیں انہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کی نوعیت کیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ان الارض للّٰہ (اعراف ۱۲۸) سے زمین کی اجتماعی ملکیت کا اصول نکالے تو کہا جائے گا کہ اس آیت کا ملکیتِ زمین کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ملکیت کے بارے میں بلاشبہہ اسلام کے احکام ہیں۔ مگر وہ دوسری آیتوں سے معلوم ہوتے ہیں نہ کہ ان الارض للّٰہ سے۔

۴۔ اس ضمن میں سینٹ پال کا حوالہ بالکل غیر متعلق ہے۔ سینٹ پال ازم جس چیز کا نام ہے وہ یہ کہ کوئی شخص اپنے فعل (خواہ اعتقادی ہو یا عملی) سے نجات نہیں پاتا، بلکہ اس خاص عقیدہ سے نجات پاتا ہے کہ خدا کا بیٹا مصلوب ہو کر انسان کے پیدائشی گناہ کا کفارہ ہو گیا۔ بالفاظ دیگر، سینٹ پال ازم یہ ہے کہ انسان کی نجات کا دارومدار معروف معنوں میں نہ ایمانیات پر ہے اور نہ اعمال پر۔ بلکہ کفارہ کے مخصوص تصور کو مان لینے پر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل ایک علیحدہ مذہب ہے۔ اقیموا الدین کی مذکورہ تفسیر سے اس کو کوئی مشابہت نہیں۔

۵۔ یہ بات بھی صحیح نہیں کہ جب اقامت دین کے حکم سے مراد صرف اساسی دین کی اقامت ہے تو بقیہ احکام و ضوابط کس لئے ہیں۔ قرآن سے ثابت ہے کہ شرعی احکام کی تکلیف بااعتبار "وسع" ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس حکم کی تعمیل کسی شخص یا گروہ کے وسع میں نہ ہو اس کے لئے وہ حکم اس وقت تک عملاً موقوف رہے گا جب تک اس کے اندر اس کی قدرت نہ پیدا ہو جائے۔ اساسات دین وہ ہیں جن کی استطاعت ہر شخص کو ہر وقت رہتی ہے، اللہ سے خوف و محبت کا تعلق قائم کرنا اور بندوں کے ساتھ انصاف اور خیر خواہی کا معاملہ کرنا کس کے لئے ممکن نہیں۔ اس لئے اساسات دین کی اقامت ایک عام حکم ہے جس کا مکلّف ہر شخص ہمیشہ رہتا ہے۔

اس کے برعکس احکام اجتماعی کے نفاذ کا معاملہ اقتدار کا طالب ہے۔ اس لئے اس کے نفاذ کو اقتدار کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔ جس کو جتنا اقتدار حاصل ہو، اس کے اعتبار سے اس پر وہ احکام مفروض ہوتے چلے جائیں گے جو اس کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں۔ اسی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کیوں مدنی دور میں حکومتی قوانین جاری کئے اور ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیوں تاعمر ایسا نہیں کیا۔ اس فرق کے باوجود دونوں اللہ کی نظر میں مومن کامل تھے۔ کیوں کہ کسی کے دین کا مکمل ہونا یہ ہے کہ وہ اپنے آپ پر دین کو مکمل طور پر غالب کرے نہ یہ کہ دوسروں کے اوپر مکمل حاکم بننے کے لئے ہنگامہ آرائی کرے۔

۶۔ یہ اندیشہ بھی صحیح نہیں کہ یہ اہل اسلام کو انفرادی عمل پر قانع بنانا ہے۔ اقیموا الدین کی آیت میں جس توحید پر قائم ہونے کا حکم ہے، دوسرے مقامات (یوسف ۱۰۸) پر یہ عمومی حکم بھی موجود ہے کہ اس پیغام توحید کو دوسرے بندگان خدا تک پہنچاؤ۔ تنفیذ قانون بلاشبہ ایک مشروط حکم ہے۔ مگر دعوت الی اللہ ایک عام حکم ہے جو ہر حال میں مطلوب ہے۔ دعوت کا کام پوری امت کے لئے عظیم ترین اجتماعی نشانہ عطا کرتا ہے۔

۷۔ ایک لفظ اکثر ایک سے زیادہ معنی رکھتا ہے۔ "دین" کا لفظ بھی قرآن میں لغوی اور مرادی اعتبار سے کئی معنوں میں آیا ہے۔ ان تمام معانی کی فہرست بنانا اور یہ کہنا کہ اقیموا الدین میں

لفظ دین کے یہ تمام معانی مراد ہیں، ایک غیر علمی بات ہے۔ کیوں کہ لفظ کا مفہوم ہمیشہ سیاق کے اعتبار سے متعین ہوتا ہے نہ کہ مختلف مفہومات کی گنتی سے۔ اس طریق استدلال کی غلطی اس سے واضح ہے کہ قرآن کی پہلی سورہ میں دین کا لفظ "جزا" کے معنی میں آیا ہے۔ اب اگر مذکورہ طریق استدلال کو صحیح سمجھا جائے تو اقامت دین کے مفہوم میں یہ بھی شامل کرنا پڑے گا کہ مسلمان پر لازم ہے کہ وہ جدوجہد کر کے روز جزا کو برپا کریں تاکہ لوگوں کو ان کے عمل کا بدلہ دیا جاسکے۔ پھر کیا اس انقلابی تعبیر کے دعویدار اپنے دین کو مکمل کرنے کے لئے مالك يوم الدين بننے کو بھی اپنے پروگرام میں شامل کریں گے۔

۸۔ اقیموا الدین کو اساسات دین کی اقامت کے معنی میں لینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ "موٹی موٹی تعلیمات کو لے لیا اور باقی سب کو چھوڑ دیا۔" اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس متفق علیہ دین کو پکڑو جو اصلاً اور دائماً مطلوب ہے۔ فروعی اور اختلافی چیزوں کو مدار اقامت نہ بناؤ۔ اس سے مراد "موٹی موٹی تعلیمات" نہیں ہیں بلکہ وہ اصلی اور حقیقی تعلیمات ہیں جن پر آخرت کی نجات کا انحصار ہے۔ انبیاء کی غیر اختلافی تعلیمات کیا تھیں۔ قرآن کے تتبع سے اس کو واضح طور پر معلوم کیا جاسکتا ہے۔ چند حوالے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ اللہ کے سوا کسی کو الٰہ نہ بنانا	الانبیاء	۲۵
۲۔ صرف ایک اللہ کی عبادت کرنا	فصلت	۱۴
۳۔ اللہ سے ڈر کر زندگی گزارنا	النحل	۲
۴۔ رزق طیب کھانا اور عمل صالح کرنا	المومنون	۵۱
۵۔ ایک دوسرے کے ساتھ انصاف برتنا	الحدید	۵۲
۶۔ دوسروں کی ڈالی ہوئی اذیت پر صبر کرنا	الاحقاف	۳۵
۷۔ دعوت حق کا ساتھ دینا	آل عمران	۸۱
۸۔ لوگوں کو جہنم سے ڈرانا اور جنت کی خوش خبری دینا	النساء	۱۶۵

یہی تمام انبیاء کا دین رہا ہے اور یہی وہ دین ہے جو اصلاً اور حقیقۃً اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ ظاہری اعمال بھی وہی مقبول ہیں جن میں مندرجہ بالا تعلیمات کی روح پائی جائے۔ اس کے بغیر کسی عمل کی کوئی قیمت نہیں۔ مزید یہ کہ انہیں تعلیمات میں اللہ کا پورا دین آجاتا ہے۔ جو شخص ان چیزوں پر قائم ہو جائے وہ گویا پورے دین پر قائم ہو گیا۔ اللہ کے نزدیک اس نے اپنے دین کو کامل کر لیا۔ دین اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے کوئی خارجی "نظام" نہیں ہے جس کو اقتدار پر قبضہ کر کے لوگوں کے اوپر نافذ کیا جائے۔

دین حقیقۃً آدمی کی اپنی زندگی کا نقشہ ہے۔ آدمی کا اپنا وجود جس کے ساتھ وہ صبح و شام جی رہا ہے، جس کو لے کر وہ پیدا ہوتا ہے اور جس کو لے کر وہ مر جاتا ہے، اس وجود کو دین دار بنانا اور اس کو ہمہ تن اللہ کی مرضیات پر ڈھال لینا ہی دراصل اقامت دین ہے۔ یہ انسانی وجود کسی قانون یا کسی سیاسی ادارہ کی گرفت سے باہر کی چیز ہے۔ یہ صرف آدمی کے اپنے ارادہ کی گرفت میں آتا ہے۔ اس پر کسی دوسرے کا حکم نہیں چلتا بلکہ صرف اپنا حکم چلتا ہے۔ اسی انسانی وجود پر خود اپنے ارادہ سے دین کو غالب کرنے کا نام اقامت دین ہے نہ کہ حکمرانوں سے سیاسی منازعت کرنے کا یا دوسروں کی پیٹھ پر کوڑا مارنے کا۔

سیاسی اقتدار بھی بلاشبہہ اسلام کا ایک جزئیہ ہے۔ مگر وہ اہل اسلام پر اللہ کا انعام (نور ۵۵) ہے۔ یہ انعام صرف اس وقت ملتا ہے جب کہ اہل اسلام کا کوئی گروہ قابل لحاظ تعداد میں اپنے اوپر مذکورہ دین کو قائم کر چکا ہو۔ اساسات دین کی اقامت کے بعد ہی شرائع دین کی اقامت کے مواقع کھولے جاتے ہیں۔ اصل دین پر خود قائم ہو جانا گویا اپنی پیٹھ کو "کوڑے" کے لئے پیش کر دینا ہے۔ جو لوگ اس خود سپردگی کا ثبوت دے دیں انہیں کو دوسروں کی پیٹھ پر کوڑا مارنے کا سیاسی اجازت نامہ عطا ہوتا ہے۔ خود سپردگی کی اس کیفیت کے بغیر لوگوں کو کوڑا مارنا خدا کی زمین میں صرف فساد برپا کرنے کا باعث ہوتا ہے نہ کہ انصاف قائم کرنے کا۔ ایسے لوگ جو دوسروں کی پیٹھ پر کوڑا لگانے کے لئے تو بہت بے قرار ہوں، مگر خود اپنی "پیٹھ" پر لفظی تنقید کو بھی برداشت نہ

کریں، وہ اللہ کی نظر میں ظالم ہیں۔ قیامت میں ان سے پوچھا جائے گا کہ جب تمہاری انانیت کا یہ حال تھا کہ تم لفظی کوڑے کی مار برداشت کرنے کے لئے بھی تیار نہ تھے تو تم کو کیا حق تھا کہ دوسروں کے اوپر مادی کوڑے برسانے کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ اس سیاسی تعبیر کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ جو چیز اللہ کے نزدیک اہم تھی وہ لوگوں کے نزدیک غیر اہم بن گئی اور جو اللہ کے نزدیک غیر اہم تھی وہ لوگوں کے نزدیک اہم قرار پائی۔ مذکورہ مفسر اقیموا الدین کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"انبیاء علیہم السلام کو جب اس دین کے قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تو اس سے مراد صرف اتنی بات نہ تھی کہ وہ خود اس دین پر عمل کریں۔ اور اتنی بات بھی نہ تھی کہ وہ دوسروں میں اس کی تبلیغ کریں تاکہ لوگ اس کا برحق ہونا تسلیم کرلیں، بلکہ یہ بھی تھی کہ جب لوگ اسے تسلیم کرلیں تو اس سے آگے بڑھ کر پورا کا پورا دین ان میں عملاً رائج اور نافذ کیا جائے۔ تاکہ اس کے مطابق عمل در آمد ہونے لگے اور ہوتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ دعوت و تبلیغ اس کام کا لازمی ابتدائی مرحلہ ہے جس کے بغیر دوسرا مرحلہ پیش نہیں آسکتا۔ لیکن ہر صاحب عقل آدمی خود دیکھ سکتا ہے کہ اس حکم میں دعوت و تبلیغ کو مقصود کی حیثیت نہیں دی گئی ہے۔ بلکہ دین قائم کرنے اور قائم رکھنے کو مقصود قرار دیا گیا ہے۔ دعوت و تبلیغ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ضرور ہے مگر بجائے خود مقصد نہیں ہے۔ کجا کہ کوئی شخص اسے انبیاء کے مشن کا مقصد وحید قرار دے بیٹھے۔" (صفحہ ۴۸۸)

قرآن میں تمام انبیاء کے بارے میں صراحۃً یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ صرف تبلیغ (پہنچا دینے) پر مامور تھے۔ قوموں کو پوری طرح باخبر کر دینے کے بعد ذاتی ذمہ داری کی حد تک ان کا کام ختم ہو جاتا تھا۔ "قائم کرنا اور قائم رکھنا" تمام تر مدعو کے اپنے رد عمل پر منحصر ہے۔ اس کو انبیاء کی ذمہ داری کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے۔ قرآن میں کوئی ایک آیت ایسی نہیں ہے جس میں نبیوں کے مشن کو "قائم (نافذ) کرنے اور قائم (نافذ) رکھنے" کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہو۔

اس کے برعکس کثرت سے ایسی آیتیں موجود ہیں جن میں پہنچا دینے کو ان کا فرضِ منصبی بتایا گیا ہے۔ مثلاً:

فھل علی الرسل الاالبلاغ المبین (النحل ۳۵) پس رسولوں پر ذمہ نہیں مگر پہنچا دینا کھول کر۔

وما نرسل المرسلین الا مبشرین و منذرین (الانعام ۴۸) اور نہیں بھیجتے ہیں ہم پیغمبروں کو مگر بشارت دینے والے اور ڈرانے والے۔

دعوتی جدوجہد کی عملی تفسیر انبیاء کرام کی زندگیاں ہیں۔ ہر نبی نے دعوت دین کے کام کو کامل اور مکمل صورت میں انجام دیا۔ اس لئے اس مہم کی اسی انجام دہی کو "مقصود" کی حیثیت دی جائے گی جو تمام انبیاء کے یہاں مشترک طور پر پائی جاتی ہو۔ اور معلوم ہے کہ تمام انبیاء کے یہاں جو چیز مشترک طور پر پائی جاتی ہے وہ پہنچا دینا ہے نہ کہ "پورے کے پورے دین کو عملاً رائج و نافذ کر دینا"۔ یہ واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ دعوتی مشن کا اصل مقصود یہ ہے کہ مدعو تک خدا کا پیغام پوری طرح پہنچ جائے۔ نہ کہ اس کو قائم کرنا اور قائم رکھنا۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا تعلق اہلیت سے ہے نہ کہ فرض سے۔ یعنی ایسا نہیں کہ مسلمانوں کا یہ لازمی فریضہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ سیاسی تحریک چلا کر حکومت قائم کریں۔ بلکہ درست بات یہ ہے کہ اللہ جب کسی گروہ کے اندر حکومت کی اہلیت پاتا ہے تو وہ اس کے حق میں ایسے اسباب پیدا کرتا ہے کہ اس کو حکومت واقتدار کا منصب حاصل ہو جائے۔

جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے، یہ اہلیت بنیادی طور پر دو ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: یا داؤد إنا جعلناك خليفة فى الارض فاحكم بين الناس بالحق ولاتتبع الهوى (ص ۲۶) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حاکم کے لئے دو لازمی صفات مطلوب ہیں کہ وہ ذاتی خواہشات اور تعصبات سے اوپر اٹھ گیا ہو۔ اور یہ کہ وہ ہر حال میں حق اور عدل پر فیصلہ کرے، خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔

زمین کے سیاسی اقتدار پر فائز ہونے کی یہ لازمی شرط ہے۔ جو لوگ اپنے اندر یہ دونوں شرطیں پیدا کر لیں وہ اپنے آپ حکومت و اقتدار کے مستحق ہو جائیں گے۔ ان دونوں شرطوں کے بغیر کسی بھی گروہ کو حکومت ملنے والی نہیں، اور اگر مل جائے تو وہ اس کے پاس باقی رہنے والی نہیں۔

خلاصہ

قرآن کے مطابق اقامت دین اور اقامت حکومت دونوں بالکل الگ الگ چیزیں ہیں۔ اقامت دین سے مراد دین کی انفرادی پیروی، اور اقامت حکومت سے مراد اسلامی قوانین کا اجتماعی نفاذ ہے۔ ایک فرد کا خدا کے دین کو اختیار کرنا صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ اس کے دل میں اس کا قوی ارادہ پیدا ہو جائے۔ دین کو سچائی کے طور پر دریافت کرنا، اللہ سے تقویٰ کا تعلق پیدا ہو جانا، آخرت کی جواب دہی کا شدید احساس، یہ وہ چیزیں ہیں جو ایک فرد کے اندر دین کی پیروی کا طاقتور ارادہ پیدا کرتی ہیں۔ اگر یہ محرکات آدمی کے دل کے اندر موجود نہ ہوں تو فرد کا دین الٰہی قائم ہونا ممکن نہیں۔

اجتماعی دائرہ میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا تعلق سب سے زیادہ اس بات سے ہے معاشرہ کے اندر اس کی قبولیت کا مادہ پیدا ہو چکا ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی حکومت اوپر نافذ نہیں کی جاتی بلکہ خود معاشرہ کے اندر سے ابھرتی ہے۔ اسلام کے اجتماعی قوانین کے نفاذ کے لئے پہلا کام معاشرہ کو تیار کرنا ہے۔ اگر معاشرہ تیار نہ ہو تو محض سیاسی ہنگامہ آرائی سے اسلامی حکومت کا قیام ممکن نہیں۔

برائی کا سرچشمہ کوئی حکمراں گروہ نہیں ہے۔ برائی کا حقیقی سرچشمہ انسان کا اپنا نفس ہے۔ جب تک نفس کی اصلاح نہ ہو، کوئی بھی خارجی تدبیر حقیقی دینی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی، نہ فرد کی زندگی میں اور نہ معاشرہ کی زندگی میں۔

سوال

کہا جاتا ہے کہ شہد ایک پاک غذا ہے اور نہایت مفید ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ شہد تو ایک مکھی کا فضلہ ہے۔ دنیا میں لاکھوں قسم کے جانور ہیں مگر کسی بھی جانور کا فضلہ پاک نہیں۔ پھر شہد کی مکھی کا فضلہ کیونکر پاک ہو سکتا ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیں (ایک قاری الرسالہ)

جواب

یہ صحیح ہے کہ عام مکھیوں کا یا کسی دوسرے جانور کا فضلہ پاک نہیں۔ مگر شہد کی مکھی جو شہد تیار کرتی ہے وہ اس کا فضلہ نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ شہد مکمل طور پر ایک پاک غذا ہے۔ جو انتہائی پاک طریقہ سے مخصوص فطری نظام کے تحت تیار کی جاتی ہے۔

شہد کی مکھی ایک استثنائی مخلوق ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پھولوں سے قدرتی مٹھاس حاصل کرتی ہے۔ اس کو لے جا کر وہ اپنے چھتہ کے اسٹور میں جمع کرتی ہے۔ یہ کام اول سے آخر تک نہایت پاکیزہ طریقہ پر ہوتا ہے۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ دنیا میں تقریباً ۲۰ ہزار قسم کی مکھیاں ہیں۔ اور کروروں قسم کے جانور ہیں۔ مگر شہد کی مکھی کے اندر ایک انتہائی استثنائی صفت پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس کے جسم میں دہرا معدہ (double stomach) کا نظام قائم ہے۔

اس کی خوراک کے لئے ایک علیحدہ معدہ ہے جس کے اندر وہ اپنی خوراک داخل کرتی ہے اور اس کو ہضم کر کے اپنے جسم کی غذائی ضرورت پوری کرتی ہے۔ جہاں تک پھولوں سے حاصل کئے ہوئے رس کا تعلق ہے جس کو شہد کہا جاتا ہے، اس کو وہ علیحدہ طور پر ایک خصوصی معدہ میں جمع کرتی ہے:

> Besides abdomen they also have a special stomach called the honey stomach in which they carry nectar. (*The World Book Encyclopaedia*, Vol-2, p. 184)

شہد کی مکھی کے بارے میں اس تحقیق سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ شہد کسی مکھی کا فضلہ نہیں ہے۔ وہ پھولوں میں پیدا ہونے والا میٹھا اور پاکیزہ رس ہے جس کو

فطری انتظام کے تحت پھول سے نکال کر شہد کی مکھی اپنے مخصوص اسٹور روم میں جمع کرتی ہے اور پھر اس کو لے جا کر چھتہ کے پاکیزہ خانوں میں ذخیرہ کر دیتی ہے تاکہ وہ انسان کے کام آسکے۔

دوسری اہم بات جو اس سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ شہد کی مکھی خدا کے وجود اور خدا کی قدرت کا ایک عظیم ثبوت ہے۔ جیسا کہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے، شہد کی مکھی کے اندر خصوصی معدہ ہونے کا نظام ایک استثنائی واقعہ ہے۔ زمین پر کروڑوں قسم کے حیوانات پائے جاتے ہیں مگر خصوصی معدہ کا یہ منفرد نظام صرف شہد کی مکھی کے اندر موجود ہے۔ وہ انسان کی ضرورت کے لئے اس کے اندر استثنائی طور پر رکھا گیا ہے۔ یہ استثناء (exception) ثابت کرتا ہے کہ اس دنیا کی تخلیق میں ذہین منصوبہ بندی پائی جاتی ہے۔ اور ذہین منصوبہ بندی (intelligent planning) ایک خالق کے وجود کا یقینی ثبوت ہے۔

یہ استثناء ایک بامعنی مداخلت کو بتاتا ہے۔ اور جب کسی نظام میں اس کے عموم کے خلاف بامعنی مداخلت کا ایک واقعہ ثابت ہو جائے تو اس کے بعد صاحب مداخلت کا وجود اپنے آپ ثابت ہو جاتا ہے۔

سوال

دنیا میں ہمیشہ جادو پایا جاتا رہا ہے۔ فرعون مصر کے جادوگروں سے لے کر اب تک جادوگری کا یہ فن موجود ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ جادو کے زور پر چیزوں کو بدلا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ فرعون کے زمانہ میں مصر کے جادوگروں نے رسیوں اور لاٹھیوں کو بدل کر انہیں سانپ بنا دیا تھا (طٰہٰ ٦٦) کیا یہ کسی انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ خدا کی تخلیق کو بدل دے اور چیزوں کو کچھ سے کچھ بنا دے۔ (ایک قاری الرسالہ، ناندیڑ)

جواب

جادو کے بارے میں اس قسم کا خیال درست نہیں۔ جادوگر جو کام کرتا ہے وہ نظر بندی ہے نہ کہ کسی چیز کو بدل کر اس کو کچھ سے کچھ کر دینا۔ اس سلسلہ کا ایک دلچسپ واقعہ وہ ہے جو آگرہ

میں ۸ نومبر ۲۰۰۰ کو پیش آیا۔ یہ واقعہ اسی زمانہ کے اخباروں میں چھپا تھا۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ آگرہ کے تاج محل کو دیکھنے کے لئے وہاں بہت سے لوگ اکٹھا تھے۔ اس وقت وہاں کلکتہ کا مشہور جادوگر پی۔ سی سارکار (P. C. Sorcar) آیا۔ اس نے ۲ منٹ کے لئے تاج محل کو "غیر موجود" کر دیا۔ دیکھنے والوں نے اچانک دیکھا کہ تاج محل دن کی روشنی میں ان کی نظروں سے غائب ہو گیا ہے۔ دو منٹ کے بعد تاج محل دوبارہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوا دکھائی دینے لگا۔ اس معاملہ کی وضاحت کرتے ہوئے خود مذکورہ جادوگر نے بتایا کہ میں نے تاج محل کو غیر موجود نہیں کیا تھا بلکہ صرف ایک ٹرک (trick) کے ذریعہ ایسی تدبیر کی تھی کہ تاج محل وقتی طور پر لوگوں کو دکھائی نہ دے۔ اس نے کہا کہ اس قسم کے جادو کی حقیقت یہ ہے کہ وہ وقتی طور پر تصرف کر کے انسان کی آنکھ اور چیز (object) کے درمیان روشنی کا سلسلہ منقطع کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ چیز موجود ہوتے ہوئے بھی دیکھنے والوں کو دکھائی نہیں دیتی یا کسی اور صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ حیدر آباد کے انگریزی اخبار دکن ہیرالڈ (Deccan Herald) کے مطابق مذکورہ جادوگر نے اس معاملہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

The Taj Mahal did not disappear, it was only out of sight. An object is said to have vanished when the light rays coming from that object cannot enter the eyes. If the rays coming from the object are bent, the image can be distorted or varished.

(*The Deccan Herald*, Hyderabad, December 24, 2000)

بنگال کے مذکورہ جادوگر مسٹر سرکار نے مزید کہا کہ سائیں بابا جیسے لوگ جو چمتکار دکھاتے ہیں وہ سب میں بھی دکھا سکتا ہوں۔ فرق یہ ہے کہ سائیں بابا جیسے لوگ اپنے آپ کو گاڈ (God) کہتے ہیں، مگر میں اپنے آپ کو پریٹنڈر (Pretender) کہتا ہوں۔

سوال

میرا کام ایسا ہے کہ مجھ کو زیادہ تر ہندوؤں کے درمیان رہنا پڑتا ہے، ہندو لوگوں سے اکثر باتیں ہوتی ہیں۔ میں نے پایا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے دو سب سے بڑی شکایتیں ہیں۔ ایک یہ

کہ مسلم حکمرانوں، مثلاً اورنگ زیب نے ہندوؤں کے اوپر ظلم کیا، دوسری شکایت یہ ہے کہ مسلم لیڈروں نے ملک کا بٹوارہ کرایا، میں ان سے کہتا ہوں کہ یہ تو پہلے کی باتیں ہیں۔ آج کا ہندستانی مسلمان تو ہندوؤں سے پوری طرح میل ملاپ کر کے رہنا چاہتا ہے مگر وہ لوگ میرے اس جواب پر مطمئن نہیں ہوتے، ایسی حالت میں رہنمائی فرمائیں کہ ہم کو کیا کرنا چاہئے۔ (ایک قاری الرسالہ)

جواب

اس مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ آپ یہ کہیں کہ ہم تو مسلمانوں کی نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اورنگ زیب اور مسٹر جناح کے زمانے میں تو ہم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ پھر ہمارے اوپر ان کے کیے کی ذمہ داری کیوں۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی عمل ایک مشترک عمل ہوتا ہے۔ قوم کے کچھ لوگ ایک عمل کریں اور قوم کے دوسرے افراد اس پر خاموش رہیں تو پوری قوم اس عمل میں شریک سمجھی جائے گی۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ افراد ہیں جو اعلان کے ساتھ اس عمل سے اپنے آپ کو ڈس اون (disown) کریں، یعنی اس سے اپنی بے تعلقی اور علیحدگی کا اعلان کر دیں۔

ہندستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان معتدل تعلقات صرف اس وقت قائم ہو سکتے ہیں جب کہ وہ اعلان کے ساتھ مغل حکمرانوں یا تقسیم ہند کے لیڈروں سے اپنے آپ کو ڈس اون (disown) کریں، یہ کہنا کافی نہیں کہ ہم تو اس وقت موجود ہی نہ تھے۔ قرآن میں رسول اللہ کے ہم عصر یہودیوں کو پچھلے نبیوں کے قتل کا مجرم ٹھہرایا گیا ہے (النساء ۱۵۵)۔ حالانکہ یہ لوگ یہودیوں کی بعد کی نسل سے تعلق رکھتے تھے مگر چونکہ وہ اپنے پچھلے اکابر کے فعل سے اپنے آپ کو ڈس اون (disown) نہیں کرتے تھے اس لئے بعد کے یہودیوں کو بھی پچھلے یہودیوں کے ساتھ بریکٹ کر دیا گیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ مسلمان اپنے سابق حکمرانوں یا اپنے سابق لیڈروں کو ڈس اون (disown) کیوں نہیں کرتے۔ اس پر غور کیجئے تو ایک بے حد سنگین حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ مسلمان اسلام کی فکری عظمت پر کھڑے ہوئے نہیں ہیں، وہ بعد کو بننے والی مسلم تاریخ کی عظمت پر کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ اللہ کی عظمت کے بجائے اپنے سیاسی اکابر کی

عظمت میں جی رہے ہیں۔ ایسی حالت میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کو محسوس ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنے سیاسی اکابر کو ڈس اون (disown) کیا تو وہ اچانک بے زمین ہو جائیں گے اس کے بعد عظمت کی کوئی اور زمین نہ ہوگی جس کے اوپر وہ پُر فخر طور پر کھڑے ہو سکیں۔

مزید یہ کہ اللہ کی دریافت آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتی ہے، جب کہ پُر عظمت تاریخ سے اس کو فخر کی غذا ملتی ہے۔ موجودہ مسلمان اپنی زوال یافتہ نفسیات کی بنا پر تواضع میں کوئی لذت نہیں پاتے، اس کے برعکس فخر اور ناز میں جینا ان کو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے حالانکہ مومن وہ ہے جو تواضع کی نفسیات میں جیے، نہ کہ فخر و ناز کی نفسیات میں۔

سوال

ماہنامہ الرسالہ کا شمارہ فروری ۲۰۰۱ دیکھا۔ میرے خیال سے یہ شمارہ ایک قسم کا نمبر ہے۔ میرے نزدیک اس کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے مختلف ملکوں میں جو سیاسی اور انقلابی تحریکیں اٹھائی گئیں ان کو آپ غیر اسلامی سمجھتے ہیں۔ مگر اس نقطۂ نظر کے حامیوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ تحریکیں اسلام کے مطابق ہیں۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: **من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه فإن لم يستطع فبقلبه و ذلك اضعف الايمان** (مشکوۃ المصابیح ۳/۱۴۲۱) اس فرمان رسول کے مطابق تغییر منکر مسلمانوں کا لازمی فریضہ ہے۔ یہ تحریکیں اسی فریضہ کو ادا کرنے کی کوشش ہیں۔ تغییر منکر کے فریضہ کو ادا کرنے کی دوسری اور کوشش کیا ہو سکتی ہے (ایک قاری الرسالہ، حیدر آباد)

جواب

آپ نے مذکورہ تحریکوں کی حمایت میں جس دلیل کا ذکر کیا ہے وہ صرف ایک مغالطہ ہے۔ وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ حضرات قرآن و حدیث کو اس طرح نہیں لیتے کہ خالی الذہن ہو کر اسلامی حکم کو معلوم کریں۔ بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اس کو کسی نہ کسی طرح آیتوں اور حدیثوں کے حوالے سے صحیح ثابت کر سکیں۔

اب مذکورہ حدیث رسول پر غور کیجئے۔ حدیث کے اصل الفاظ کے مطابق، مسلمان کی ذمہ داری استطاعت کے بقدر ذاتی پیروی ہے، نہ کہ استطاعت کے دائرہ کو بڑھانے کے لئے دوسروں سے لڑائی چھیڑنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بر وقت جو استطاعت آپ کو حاصل ہے، اس استطاعت کے اعتبار سے آپ کو اپنی ممکن ذمہ داری ادا کرنا چاہئے۔ اپنے ممکن دائرہ کو چھوڑ کر غیر ممکن دائرہ پر قابض ہونے کے لئے ہنگامہ آرائی کرنا اس حکم شریعت کی خلاف ورزی ہے نہ کہ اس کی پیروی۔

سوال

پہلے میں ایک گروہ سے وابستہ ہوا اور ان لوگوں کے ساتھ رہ کر میں نے چند مصنفوں کی کتابیں پڑھیں مثلاً سید قطب، سید احمد شہید وغیرہ۔ ان میں زیادہ تر جہاد بالسیف کا ذکر تھا۔ آخر کار میں بارہویں کا امتحان دیئے بغیر مجاہدین کے ساتھ چل پڑا اور میں تقریباً چار سال ان سے وابستہ رہا۔ پھر میں نے گھر والوں کو بھی چھوڑ دیا۔ گھر والوں کو بہت تکلیف ہوئی۔ ہمارے گھر کی مالی اور تعلیمی سرگرمیوں پر بُرا اثر پڑا۔ 1999 میں میں گرفتار ہوا اور اللہ پاک کی مرضی سے میری جان بچ گئی۔ اس کے بعد مجھے پولیس نے P.S.A. (public safety act) کے مطابق نظر بند رکھا۔ جیل خانے میں میری ملاقات ایک معروف شخصیت سے ہوئی اس نے مجھے ایک کتاب (اسلام ایک تعارف) دی وہ آپ کی ہی لکھی ہوئی تھی۔ پھر میں نے آپ کی پچاس ساٹھ کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد میرا ذہن بدل گیا میں نے پھر جیل میں (examination form) بھر دیا اور باقاعدہ طریقے سے میرا T.D.C. کا امتحان conduct ہوا۔ اب میں دسمبر ۲۰۰۰ یعنی ۹ رمضان المبارک کو رہا (release) ہوا۔ اب میری خواہش ہے کہ اسلام پر زندگی کو چلاؤں اور پڑھائی بھی کروں لیکن گھر کے حالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔ اور اس وقت میری عمر 21 سال کی ہے یہ میرے کمانے کا بھی ٹائم ہے۔ مولانا صاحب آپ سے گذارش ہے کہ آپ آگے میری رہنمائی فرمایئے۔ (ایک مسلم نوجوان، کشمیر)

جواب

یہ صرف ایک مسلم نوجوان کی کہانی نہیں، بلکہ وہ موجودہ زمانہ کے لاکھوں مسلمانوں کی

کہانی ہے۔ موجودہ زمانے میں جہاد کے نام پر مختلف ملکوں میں جو انتہا پسندانہ تحریکیں چلائی انہوں نے بے شمار مسلم خاندانوں کو تباہ کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں نہ اسلام کو کچھ ملا اور نہ مسلمانو کو۔ اس قسم کی تحریکیں بلاشبہہ اسلامی تحریکیں نہیں اور نہ اس قسم کی عسکری سرگرمیاں اسلا جہاد ہیں۔ یہ سب ایک نادانی کا ردعمل تھا جو اسلام کے نام پر کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی تحریک کو اس کے نتیجہ کے لحاظ سے دیکھنا چاہئے۔ جو تحریک لوگوں میں نفرت اور تشدد کو بھڑکائے وہ کبھی اسلامی تحریک نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح جو عسکری سرگرمی لوگوں کی تباہی میں اضافہ کرے وہ کبھی اسلامی جہاد نہیں ہو سکتا۔ جو ناپختہ نوجوان اس قسم کی تحریکوں کا شکار ہوتے ہیں وہ شاید اپنی کم فہمی کی بنا پر قابلِ معافی قرار پائیں مگر جو لوگ ان تحریکوں کی لیڈری کرتے ہیں وہ بلاشبہہ ایک سنگین جرم کر رہے ہیں جو کسی طرح قابل معافی نہیں۔

سوال

قرآن میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا اور پھر جنت میں داخل کیا۔ پھر جنت سے نکال دیا اور زمین پر چھوڑ دیا اور اس کے بعد دنیا بننی شروع ہوئی۔ چونکہ ساری کائنات کے لوگ اسی جوڑے (حضرت آدمؑ اور حضرت حوّا) کے بعد دنیا میں آئے اور پہلا جوڑا یہی تھا۔ میرا ذہن یہ سوال کرتا ہے کہ اگر ہم آج کی دنیا میں دیکھیں تو مجھے اپنی زبان (lan-guage) اپنے ماں باپ سے ہی ملی ہے تو کیا وجہ ہے کہ اگر ہم سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد یعنی آدمؑ کی اولاد ہیں تو ہماری زبان ایک کیوں نہیں ہے۔ یہ اتنی زبانیں کہاں سے پیدا ہوئیں ساری دنیا میں ایک زبان ہونی چاہئے تھی جس کو سب سمجھ سکتے اور بول بھی سکتے۔ یعنی حضرت آدم کی زبان۔ (نذیر احمد صوفی، سری نگر)

جواب

یہ ایک کنفیوزن کی بات ہے نہ کہ حقیقی معنی میں کوئی سوال۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ ضروری سوال اور غیر ضروری سوال میں فرق کرے ورنہ وہ ساری عمر ذہنی الجھنوں میں مبتلا رہے

گااور اس کے اندر صحت مند فکر کا ارتقاء نہ ہو سکے گا۔

جہاں تک اصل سوال کا تعلق ہے اس کو عام تجربہ کے تحت سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک خاندان میں چار لڑکے ہیں۔ تلاش معاش کے تحت وہ چار مختلف ملکوں میں چلے جاتے ہیں اور وہیں بس جاتے ہیں۔ اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ چاروں کی زبانیں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گی۔ تقریباً اسی طرح کا کچھ معاملہ حضرت آدمؑ کی اولاد کے ساتھ پیش آیا۔ مہاجرت کے ذریعہ لوگوں کی زبانیں بدلتی رہیں یہاں تک کہ دھیرے دھیرے بہت سی زبانیں وجود میں آگئیں۔ اس موضوع پر آپ کو وہ کتابیں پڑھنی چاہئیں جو زبانوں کی تاریخ پر لکھی گئی ہیں۔

سوال

آپ الرسالہ میں جہاں قرآن وحدیث کا حوالہ عربی میں پیش کرتے ہیں تو اس کا ترجمہ بھی کر دیتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایسا نہ ہونے کی وجہ سے عربی نہ جاننے والوں کو تشنگی رہ جاتی ہے۔ جیسے ماہ اکتوبر ۲۰۰۰ کے رسالہ کے صفحہ ۲۶ میں سطر ۱۵۔۱۶ دیکھیں۔ آپ سے گذارش ہے کہ براہِ کرم جہاں بھی قرآن وحدیث کا حوالہ عربی میں دیں تو عربی کا ترجمہ اردو میں ضرور لکھیں۔

(امان اللہ، سیوان)

جواب

یہ شکایت درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ الرسالہ محض عام قسم کا ایک ماہنامہ نہیں، وہ مکمل طور پر ایک مشن ہے اس کا مقصد پڑھنے والے کو صاحب مشن بنانا ہے، نہ کہ اس کو وقتی قسم کی ایک ذہنی تفریح فراہم کرنا۔ آپ کو چاہئے کہ الرسالہ کو آپ اپنے لئے رابطہ کا ذریعہ بنائیں۔ الرسالہ کی باتوں پر لوگوں سے مذاکرہ کریں۔ الرسالہ کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ اس طرح یہ ہونا چاہئے کہ اگر ایک قاری کو اس کا کوئی عربی لفظ یا جملہ سمجھ میں نہ آئے تو اس کو سمجھنے کے لئے وہ اپنے قریبی عالم سے ربط قائم کرے۔ اور اگر کسی قاری کو انگریزی کا کوئی لفظ یا جملہ مشکل معلوم ہو تو وہ اس کو سمجھنے کے لئے اپنے قریب کے کسی انگریزی داں سے ملے۔

الرسالہ کا حقیقی قاری وہی ہے جس کی زندگی میں الرسالہ اس طرح شامل ہو جائے کہ وہ اس کے لئے لوگوں سے ربط کا ذریعہ بن جائے، وہ اس کے لئے لوگوں سے تعلقات کا مرکز و محور بن گیا ہو۔

یہ ایک ایسا کام ہے جو الرسالہ کے ہر قاری کو کرنا ہے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں کے پاس وقت ہے اور اسباب موجود ہیں تو انہیں چاہئے کہ وہ اپنے علم کو بڑھائیں۔ وہ اس بات کی کوشش کریں کہ جو چیز ان کو آج معلوم نہیں ہے، کل کے دن وہ انہیں معلوم ہو جائے۔

سوال

میں بہت مجبور ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی اور جہاں میری ممی شادی کروا رہی ہیں وہاں تو بالکل ہی نہیں کرنا چاہتی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی لڑکا صرف دنیا کو دکھانے کے لئے مجھ سے شادی کر لے۔ مجھے صرف زندگی گذارنی ہے۔ زندگی جینے کی ذرہ برابر بھی خواہش نہیں ہے لیکن سماج میں اکیلے ایک لڑکی زندگی نہیں گزار سکتی۔ اور کسی سے یہ بات کہہ نہیں سکتی اور کوئی بھی ایسا انسان نہیں ہے جس سے میں مشورہ لے سکوں۔ please آپ میری مدد کریں۔ میں اپنے جواب کا بے صبری سے انتظار کروں گی۔ (ایک مسلم خاتون)

جواب

شادی کے سلسلہ میں اکثر لڑکے یا لڑکیاں اپنی فرضی آرزوؤں کے تحت یہ سمجھ لیتے ہیں کہ دنیا میں ان کے لئے کوئی معیاری جوڑا موجود ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں نہ کوئی بیوی معیاری بیوی ہے اور نہ ہی کوئی شوہر معیاری شوہر۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر پسند والی شادیاں درمیان ہی میں ٹوٹ جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شادی معیاری جوڑے کے حصول کا نام نہیں ہے بلکہ وہ غیر معیاری جوڑے کے ساتھ نباہ کرنے کا نام ہے۔

عورت اور مرد دونوں کے لئے زندگی فطرت کا ایک قیمتی تحفہ ہے۔ ہر عورت اور ہر مرد کو چاہئے کہ وہ اس تحفہ کو خوشی کے ساتھ قبول کرے۔ وہ جینے کی طرح جئے اور جب اس کی موت آئے تو وہ اس احساس کے ساتھ مرے کہ اس نے زندگی کا فریضہ ادا کرنے میں اپنی طرف سے

کوئی کوتاہی نہیں کی۔

دوسری اہم بات یہ کہ غیر مطلوب جوڑے کے ساتھ زندگی گزارنا یا غیر مطلوب افراد کے ساتھ کام کرنا کوئی برائی نہیں۔ اس کے اندر ایک بے حد مثبت پہلو چھپا ہوا ہے وہ یہ کہ اسی کے دوران انسان کی ذہنی اور روحانی ترقی ہوتی ہے۔ ذہنی اور روحانی ترقی، اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ انسان ناموافق صورتحال پر راضی ہو جائے، وہ فرق اور اختلاف کے باوجود مل جل کر رہنے کا طریقہ سیکھ لے۔ اپنی پسند کی دنیا تلاش کرنے کا نام عقل مندی نہیں، عقل مندی یہ ہے کہ آدمی پسند کے خلاف جینے کا راز دریافت کر لے۔

ایک خط

برادر محترم جناب ڈاکٹر حبیب اللہ خاں صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امریکہ کے سفر (نومبر۔دسمبر ۲۰۰۰) میں آپ سے ملاقات میرے لئے تعجب خیز مسرت (pleasant surprise) جیسا ایک تجربہ تھا۔ دنیا میں ہر عورت اور مرد اپنے ذاتی معاملہ میں حساس ہوتے ہیں۔ مگر آپ اور آپ کے گھر والے ان نادر انسانوں میں سے ہیں جو دوسرے کے معاملہ میں حساس ہوں۔ جو دوسرے کے کنسرن (concern) کو اپنا کنسرن بنالیں۔

ایک روایت الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ مسلم کی روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: المومنون کرجل واحد، إن اشتکی عینه اشتکی کله، وإن اشتکی رأسه اشتکی کله (ایمان والے سب کے سب ایک فرد واحد کی طرح ہیں۔ آدمی کی آنکھ اگر درد میں مبتلا ہو تو اس کا پورا وجود اس درد کو محسوس کرتا ہے۔ اور اگر اس کے سر میں درد ہو تو اس کا پورا وجود اس درد کو محسوس کرتا ہے) صحیح مسلم، کتاب البر۔

اس حدیث میں ایک مثال کے ذریعہ اہل ایمان کے اجتماعی کردار کو بتایا گیا ہے۔ یہ مثال ایک زندہ انسان کے جسم کی ہے۔ انسانی جسم بہت سے اعضاء کا مجموعہ ہوتا ہے۔ مگر یہ تمام اعضاء اپنے کل کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ اس کا ایک عضو اگر کوئی تکلیف محسوس کرے تو اس کا پورا وجود تکلیف کے اس احساس میں اس کا شریک ہو جاتا ہے، اس کے غم کو اپنا غم بنالیتا ہے۔ یہی معاملہ حقیقی مسلم امت کا ہے۔ جماعت کے ایک فرد کو کوئی مسئلہ پیش آئے تو پوری جماعت اس کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بنالیتی ہے۔ اس کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک وہ اپنے بھائی کے مسئلہ کو آخری طور پر حل نہ کرلے۔

امریکہ کے سفر میں آپ اور آپ کے گھر والوں سے مجھ کو جو غیر متوقع تجربہ ہوا اس سے

معلوم ہوا کہ آپ اور آپ کے گھر والے، سب کے سب، مذکورہ حدیث کی گویا ایک زندہ مثال ہیں۔ آپ لوگوں نے کسی ذاتی انٹرسٹ کے بغیر ایک مسافر کے بظاہر سخت مسئلہ کو جس طرح انتہائی دلچسپی اور لگن کے ساتھ اپنا مسئلہ بنایا اور حیرت انگیز طور پر چند گھنٹوں کے اندر اس کو حل کر دیا، یہ ایک ایسا انوکھا واقعہ تھا کہ اگر میں نے اس کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو شاید مجھ کو یقین نہ آتا کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔

کسی دوسرے شخص کے مسئلہ کو دیکھ کر تڑپ اٹھنا اور اس کو حل کرنے کے لئے متحرک ہو جانا ایک انتہائی اعلیٰ قسم کا انسانی وصف ہے۔ یہ وصف اس وقت اور زیادہ قیمتی ہو جاتا ہے جب کہ صاحب مسئلہ نے اپنا مسئلہ پیش بھی نہ کیا ہو اور دوسرا شخص بطور خود اپنی اعلیٰ حساسیت کی بنا پر اس کے مسئلہ کو پوری طرح سمجھ لے اور کامل توجہ کے ساتھ اس کو حل کرنے میں لگ جائے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان اور حیوان کے درمیان یہ فرق ہے کہ انسان کے اندر تفکیری عمل (thinking process) جاری رہتا ہے جب کہ حیوان صرف اپنی جبلت (instinct) کے تحت کام کرتے ہیں۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ اگر حساسیت (sensitivity) نہ ہو تو محض تفکیری عمل زیادہ بامعنیٰ نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔

حساسیت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ سچائی کے اظہار کے بعد وہ اس کے انکار کا تحمل نہ کر سکے۔ حساسیت ہی آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ دوسرے کا درد اپنے سینہ میں محسوس کرے۔ حساسیت انسان کو روحانی ترقی کے اس درجہ تک پہنچاتی ہے جہاں وہ دوسرے کے مفاد کے لئے بھی اسی طرح تڑپ اٹھے جس طرح کوئی شخص اپنے ذاتی مفاد کے لئے تڑپتا ہے۔ حساسیت کے بغیر آدمی صرف ایک خوشنما روبوٹ (robot) ہے۔ جب کہ حساسیت کسی آدمی کو فرشتہ کے مرتبہ تک پہنچا دیتی ہے۔ کسی آدمی کے اندر جتنی زیادہ حساسیت ہو اتنا ہی زیادہ وہ اعلیٰ انسان ہوگا اور اتنا ہی زیادہ اعلیٰ مومن۔ اسی مثبت حساسیت سے وہ اعلیٰ انسانی کیریکٹر بنتا ہے جس کو قابلِ پیشین گوئی کردار (predictable character) کہا جا سکتا ہے۔

امداد باہمی کا جذبہ (co-operative spirit) انسانی ترقی کے لئے بے حد اہم ہے۔ دنیا میں وہی لوگ اعلیٰ ترقی حاصل کرتے ہیں جن کے اندر ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ ہو۔ اس کو قرآن میں تعاون (المائدہ ۲) کہا گیا ہے اور قرآنی احکام میں سے وہ ایک باقاعدہ حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ صحیح البخاری (کتاب الادب) میں ایک مستقل باب ان الفاظ کے ساتھ ہے: باب تعاون المؤمنین بعضهم بعضا۔

باہمی تعاون کا جذبہ ایک اعلیٰ انسانی جذبہ ہے۔ اس جذبہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دوسرے کی ضرورت کو بھی اتنا ہی اہم سمجھے جتنا اہم وہ اپنی ضرورت کو سمجھتا ہے۔ دوسرے کے کام کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ کر وہ اتنا ہی خوش ہو جتنا وہ اپنے کام کو پورا کر کے خوش ہوتا ہے۔ آدمی اپنے انفرادی خول سے نکل کر پورے سماج کے ساتھ جڑ جائے۔ ذاتی دائرہ میں سوچنے کے بجائے وہ پوری انسانیت کے دائرہ میں سوچنے لگے۔ جس سماج میں یہ آفاقی مزاج ہو اس سماج میں افراد بھی اعلیٰ ترقی حاصل کرتے ہیں اور مجموعی اعتبار سے پورا سماج بھی۔

آپ اور آپ کے گھر والوں پر اللہ کی رحمت ہو۔ آپ لوگ انشاء اللہ اس حدیث کا مصداق ہیں جس میں رسول اللہ نے فرمایا: الله فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیه (مسند احمد) یعنی اللہ اس وقت تک بندہ کی مدد پر رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد پر رہے۔ اور اللہ جب کسی کی مدد کرے تو اس کی مدد برابری کے اصول پر نہیں ہوتی۔ اللہ اس کو اس سے بہت زیادہ دے دیتا ہے جتنا اس نے کسی دوسرے کو دیا تھا۔ آپ اور آپ کے گھر والوں کے اندر میں نے جن انسانی صفات (human qualities) کا تجربہ کیا وہ مجھے ساری زندگی یاد رہے گا۔

آپ اور آپ کی اہلیہ کو اور آپ کے بچوں کو اللہ اپنی رحمت اور نصرت عطا فرمائے۔ آپ لوگوں کو دنیا اور آخرت کی اعلیٰ کامیابیوں میں حصہ دار بنائے۔ سب کی خدمت میں سلام و دعا۔

۱۵ جنوری، ۲۰۰۱ — دعا گو

وحید الدین

ماہنامہ الرسالہ کے ایک قاری کی طرف سے ہمیں ایک تفصیلی خط (۷ ادسمبر ۲۰۰۰) موصول ہوا ہے۔ موضوع کی اہمیت کی بنا پر اس خط کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

فکر کی غلطی

حضرت مولانا وحید الدین خاں صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ کافی عرصہ پہلے میں نے عتیق احمد قاسمی صاحب کی کتاب ''فکر کی غلطی'' پڑھی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں آپ کے افکار وخیالات کے بارے میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہوگئے تھے اور یہ سوال بھی پیدا ہو گیا تھا کہ آپ نے اس کتاب کا جواب کیوں نہیں دیا۔ لیکن اب جب کہ میں نے دوسری بار اس کتاب کا مطالعہ کیا تو میرا تاثر یہ ہے کہ یہ پوری کتاب بے وزن اور بے دلیل باتوں کا مجموعہ ہے۔ اور آپ کی خاموشی نے اس کتاب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے اور اس طرح یہ کتاب اپنی موت آپ مر گئی جیسے کہ یہ کتاب تھی ہی نہیں۔ اس کتاب میں آپ کی جن باتوں کو تنقید و تنقیص کا نشانہ بنایا گیا ہے، میں نے ان کو اصل ماخذوں سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی، لیکن حق یہ ہے کہ مصنف کتاب نے اکثر مقامات پر خیانت وبددیانتی سے کام لیا ہے اور بیشتر اقتباس کو سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کیا ہے اور ان کی من مانی تاویل اور غلط معانی پہنا کر تلبیس سے کام لیا ہے۔ مصنفِ کتاب نے قرآنی آیات اور احادیث کے بارے میں آپ کے جن تشریحی نوٹوں کو تنقیص و تضحیک کا نشانہ بنایا ہے، میں نے ان کی صحیح تفسیر جاننے کے لئے قدیم مفسرین اور محدثین کی کتابوں کی طرف مراجعت کی تو مجھے شرح صدر کے ساتھ آپ کی باتوں سے مکمل اتفاق ہو گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کتاب تنقید کے معنی وتعریف سے سرے سے ناواقف ہیں، کیوں کہ کتاب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب خود مصنف کی اپنی فکر کو غلط ٹھہراتی ہے نہ کہ اس کی فکر کو جس کی اس نے تنقید کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک مثال لیجئے۔ مصنف کتاب نے اپنے مقدمہ کے آغاز میں الرسالہ کے ایک شمارہ کے حوالے سے یہ اقتباس نقل کیا ہے۔

''خدا میرے لئے ایک رسمی عقیدہ نہیں ہے، خدا میری دریافت ہے، خدا کو میں نے دیکھا ہے، خدا کو میں نے چھوا ہے، بخدا میری مثال صحرائے سینا کے اس پہاڑ کی ہے جس پر خدا اترا اور اس نے اس کی ہستی کے ریزے ریزے کر دئے۔'' اس اقتباس پر مصنف کتاب نے یوں خامہ فرسائی کی ہے۔

''یہ اقتباس پڑھ کر خدا جانے آپ کا ذہن کہاں جائے، شاید آپ یقین کر بیٹھے ہوں کہ یہ

اقتباس غلام احمد قادیانی کی کسی کتاب کا ہے لیکن قیاس آرائی میں عجلت نہ کیجئے اور میری طرح آپ بھی یہ جان کر صدمے سے دوچار ہوئیے کہ یہ تحریر "علم جدید کا چیلنج" اور دوسری مفید کتابوں کے مصنف جناب وحید الدین خاں صاحب کی ہے۔ یہ خبر بظاہر ناقابل یقین ہے۔ اس لئے اگر یقین کرنے میں دشواری محسوس ہو تو جناب وحید الدین خاں کے ماہنامہ الرسالہ دسمبر ۱۹۸۶ کا شمارہ کھول کر صفحہ ۲۶ پر یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔" (فکر کی غلطی، ص ۵)

"فکر کی غلطی" کے مصنف دوسری جگہ لکھتے ہیں: وحید الدین خاں صاحب اگر زبان وادب میں صرف حقیقت کے قائل ہیں، استعارہ، مجاز اور کنایہ اگر ان کے یہاں کوئی چیز نہیں ہے تو اپنی اس تحریر کے بعد وہ اپنے اسلام کی خیر منائیں۔ انہوں نے خدا کو دیکھنے اور چھونے کی جو بات لکھی ہے، اگر ان کے ذہن میں اس کا ظاہری مفہوم ہی ہے اور انہوں نے ان جملوں میں استعارہ، کنایہ اور تلمیح سے کام نہیں لیا ہے تو ان کے گمراہ بلکہ خارج اسلام ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ (فکر کی غلطی، صفحہ ۲۶۹)

"فکر کی غلطی" کے مصنف کے اس تبصرہ کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کتاب ابھی تک رسمی عقیدہ ہی کو صحیح عقیدہ مانتے ہیں اور نرم کرسیاں اور آرام دہ بستروں پر کتابوں کی ورق گردانی ہی کو ایمان بالله کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور اس طرح اسے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں روحانی واردات اور کیفیات سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ حالانکہ مذکورہ اقتباس میں کہی گئی بات ایمان راسخ کی ترجمانی کرتی ہے اور وہ حدیث جبریل کے عین مطابق ہے۔ اس حدیث کا ایک حصہ اس طرح آیا ہے: قال فاخبرنی عن الاحسان قال أن تعبد الله كانك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك (بخاری و مسلم۔ مشکوۃ، کتاب الایمان) سائل نے کہا مجھے احسان کے بارے میں بتایئے۔ آپ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھتے ہو، تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ احسان دراصل پورے دین کی روح ہے اور اس کی کیفیت ہر اس آدمی پر طاری ہو جاتی ہے جس کا یقین ہو کہ خدا ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں بلکہ وہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے اور یہ واردات اس پر گزرتی ہے جو خدا کی معرفت کے اونچے درجہ پر پہنچ چکا ہو۔ اور اس کا تجربہ اس وقت کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے جب کہ آدمی انتہائی خشوع و خضوع اور حضور قلب کے ساتھ نماز پڑھتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ "نماز مؤمن کی معراج ہے (الصلوۃ معراج المؤمن)۔

مصنف کتاب نے مذکورہ اقتباس نقل کرنے میں تلبیس سے کام لیا ہے کیوں کہ الرسالہ کے مذکورہ شمارہ ہی کے اگلے صفحہ پر یہ عبارت بھی موجود ہے۔

"خدا بلاشبہہ اتنا بڑا ہے کہ وہ ہمارے مشاہدہ میں نہیں سماتا۔ مگر بلاشبہہ وہ تمام چیزوں سے زیادہ ہم سے قریب ہے۔ موجودہ دنیا میں ہم خدا کو اس کی ذات میں نہیں دیکھ سکتے۔ مگر خدا کو اس کی صفات میں ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں اور ہر وقت دیکھ سکتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں یہی خدا کو دیکھنا ہے۔ یہی خدا کو پانا ہے۔" (الرسالہ دسمبر ۱۹۸۶ صفحہ ۲۷)

خود مولانا وحید الدین خاں کی دوسری تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کے "مشاہدہ" کو مجاز کے معنی میں لیتے ہیں نہ کہ حقیقت کے معنی میں۔ ملاحظہ ہو موصوف کی تفسیر تذکیر القرآن کی یہ عبارت: اس دنیا میں آدمی صرف "یاد" کی سطح پر خدا کو پا سکتا ہے۔ وہ اس کو براہ راست "مشاہدہ" کی سطح پر نہیں پا سکتا۔ (تذکیر القرآن جلد اول، صفحہ ۶۵۹، الرعد آیت ۲۷ کا حاشیہ)

مصنف کتاب نے اپنی اس کتاب میں ایک عنوان اس طرح قائم کیا ہے "وحید الدین کی اقبال شناسی" اور اس کے ذیل میں الرسالہ کے شماروں سے کئی اقتباس نقل کرتے ہوئے تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ان اقتباسات میں اقبال کی تنقید کی گئی اور ان کے افکار اور خیالات پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف کتاب کے اس الزام کی صداقت کہاں تک ہے؟ اس پر بحث کے لئے یہاں وقت نہیں۔ لیکن یہ بات عرض کرتا ہوں کہ اگر مصنف کتاب واقعی اقبال کے عاشقِ صادق ہیں تو خدا کے بارے میں اقبال کے درج ذیل واقعہ کے متعلق وہ کیا کہیں گے۔

اقبال کے تذکرہ سے متعلق مشہور کتاب "روزگار فقیر" میں یہ واقعہ چھپا ہے۔ روزگار فقیر کے مصنف نے "وجود باری" کے عنوان کے تحت ممتاز حسن اور علامہ اقبال کی ایک گفتگو نقل کی ہے جو انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

"ممتاز حسن نے علامہ اقبال کو اپنی طرف متوجہ پا کر عرض کیا آپ ایک دانش ور فلسفی ہیں اور نہ صرف یہ کہ قدیم و جدید فلسفوں سے اچھی طرح آگاہ و باخبر ہیں، بلکہ آپ اپنی جگہ خود بہت بڑے مفکر ہیں، مگر اس کے باوجود آپ اپنے اشعار اور مقالات میں خدا کا ذکر غیر فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں۔ جہاں تک فلسفے کا تعلق ہے، امانول کانٹ کے فلسفیانہ افکار کی روشنی میں اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ محض عقل و فلسفہ کی رُو سے نہ تو خدا کے وجود کا اثبات ممکن ہے اور نہ اس کی تردید۔ خدا کے بارے میں جب بھی فلسفے کی رُو سے گفتگو ہو گی تو لازمی طور پر ہم وہی کہیں گے جو کانٹ نے کہا ہے۔ حیرت ہے کہ آپ اتنے بڑے مفکر اور فلسفی ہیں، پھر آپ کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدا کے وجود پر عقلی دلیل لانے کے بجائے خوش اعتقادی کے ساتھ اس کا ذکر کریں؟

ممتاز حسن کے خیالات علامہ اقبال بڑی خاموشی اور ہمدردی کے ساتھ سنتے رہے۔ انہوں نے نہ تو درمیان میں ٹوکا اور نہ ہی تعجب کا اظہار کیا۔ جب ممتاز حسن اپنی بات پوری کر چکے تو علامہ نے فرمایا:

"خدا کے متعلق پوچھتے ہو؟ میں نے اسے دیکھا ہے۔"

علامہ زیر لب مسکرائے اور تھوڑے توقف کے بعد مزید فرمایا: "انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب وہ خدا کو دیکھ سکتا ہے لیکن یہ لمحے بہت کم نصیب ہوتے ہیں۔" اور کچھ توقف کے بعد پھر فرمایا کہ "بہت ہی کم"۔

ممتاز صاحب نے دریافت کیا "کیا ہر شخص کے لیے خدا کا مشاہدہ ممکن ہے؟" علامہ نے فرمایا "یہ دروازہ کسی پر بند نہیں ہے۔ لیکن جو شخص مشاہدے کا طالب ہو اسے صبر اور انتظار لازم ہے۔"

یہ ساری گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی۔ علامہ اقبال کے اصل فقرے یہاں انگریزی میں بھی درج کیے جا رہے ہیں:

"I have seen him. There are moments in a man's life when he can experience God"

"Such moments are, however, rare" he added a little later "very rare"

"No one is shut out but he who wants the experience has to wait for it."

(روزگار فقیر جلد ۲، صفحہ ۳۴۵۔۳۴۶، ایڈیشن ۱۹۹۲)

حقیقت یہ ہے کہ صاحبِ بصیرت لوگوں کی زندگیاں خدا کے بارے میں غور و فکر اور مراقبے میں گزرتی ہیں اور ان کی ذات خدائی صفات میں ڈھل جاتی ہے۔ پھر ان کی روحانی کیفیات و واردات کا کیا کہنا۔ بخاری کی ایک طویل حدیث کے یہ الفاظ لائق غور ہیں:

و ما تقرب الّی عبدی احب الی مما افترضتُ علیه ولایزال عبدی یتقرب اِلَی بالنوافل حتی احببته فاذا احببته کنتُ سمعُه الذی یَسمَع به و بصرُه الذی یبصربه	اور میرا بندہ جن چیزوں سے میرا تقرب حاصل کرتا ہے ان میں مجھے سب سے زیادہ محبوب وہ چیزیں ہیں جو میں نے اس پر فرض کر دی ہیں اور میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے اور جب وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے تو میں اس کا کان

وَيَدُهُ الَّتِي يَبطُشُ بِهَا وَرِجلَهُ الَّتِي يَمشِي بِهَا۔ (بخاری کتاب الرقاق)

بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ان عارفانِ خدا کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

اتقوا فراسة المؤمن فإنه ينظر بنورالله (ترمذی ابواب التفسیر، سورۃ الحجر)

مختصر یہ کہ ''فکر کی غلطی'' کے مصنف نے مذکورہ اقتباس پر جو اعتراض اٹھایا ہے وہ یقین کی حد تک تعصب اور ذاتی عناد کی بنیاد پر ہے۔ اور اگر بالفرض اس اعتراض کو درست مانا جائے تو پھر مصنفِ کتاب کو اپنے محبوب شاعر اقبال کے مذکورہ واقعہ پر بھی یہی رائے قائم کرنی پڑے گی۔ اس کے علاوہ ان کی کتاب بانگِ درا کی دو نظموں 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' پر بھی وہی اعتراض عائد کرنا ہوگا۔ مذکورہ اقتباس میں خدا کو دیکھنے اور چھونے کی بات کی گئی تھی مگر ادھر تو علامہ اقبال ذات خداوندی سے براہِ راست ہمکلامی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کیا اس طرح کی مثال غلام احمد قادیانی کی کسی کتاب میں ملتی ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً مصنف کتاب نے ندوہ کے زعماء کے اشارے پر ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت اس فتنہ ساز کتاب کو غلط حوالوں اور بے بنیاد باتوں سے پر کرکے سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ ان زعماء نے اس کتاب کی اشاعت کے بعد اس کو نہ تو رد کیا اور نہ انہوں نے اس سے اعلان برأت کیا۔ مصنف کی یہ روش آخرت کی جواب دہی سے عاری ہونے کو بتاتی ہے۔ (اللہ تعالیٰ مصنف پر رحم فرمائے)

آخر میں میں کہوں گا کہ ''فکر کی غلطی'' جیسی کتابیں لوگوں کے لئے ایک پرچۂ امتحان ہیں۔ اس کتاب کو چھپنے کے بعد تمام علماء اور غیر علماء پر فرض تھا کہ وہ اس کی اسی طرح تحقیق کریں جس طرح میں نے اللہ کی توفیق سے کی ہے اور پھر اس تحقیق کے بعد ان پر یہ بھی فرض تھا کہ وہ اس افترا پردازی کے خلاف پریس میں بیانات شائع کریں۔

قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب معاشرہ میں منکرات کا ارتکاب کیا جائے اور لوگ اس پر خاموش رہیں، تو ایسا معاشرہ اللہ کی رحمت سے دور کر دیا جاتا ہے۔ یہ بہت سخت بات ہے۔ مگر ہمارے رہنماؤں میں سے شاید کوئی بھی نہیں جس کو اس کا احساس ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں فتنوں سے بچائے۔

(غلام نبی، سری نگر، کشمیر)

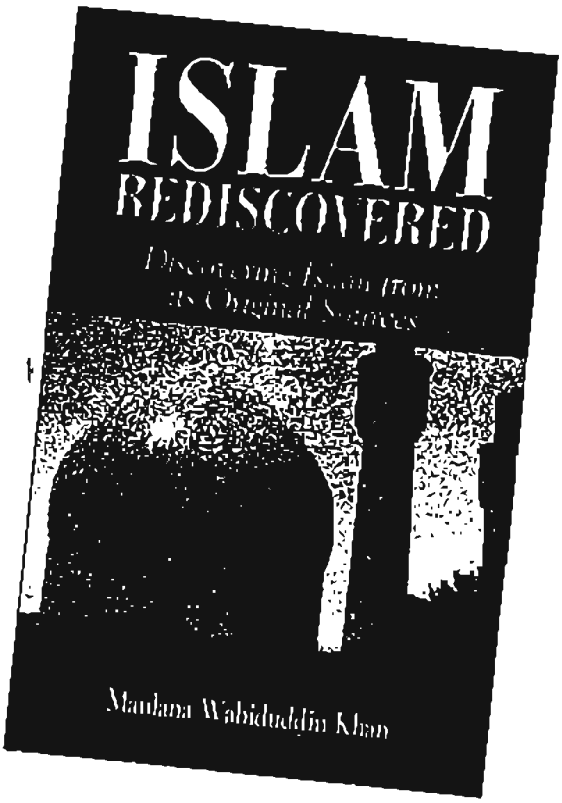

ISLAM
REDISCOVERED
Discovering Islam from its Original Sources

By Maulana Wahiduddin Khan

Rs. 195.00
ISBN: 81-87570-40-7

Goodword
B·O·O·K·S

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 435 5454, 435 6666, 435 1128
Fax: 435 7333, 435 7980
e-mail: skhan@vsnl.com

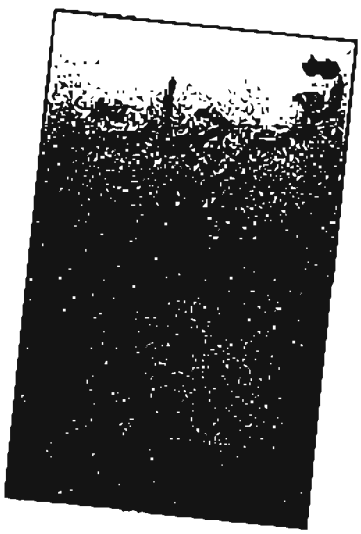

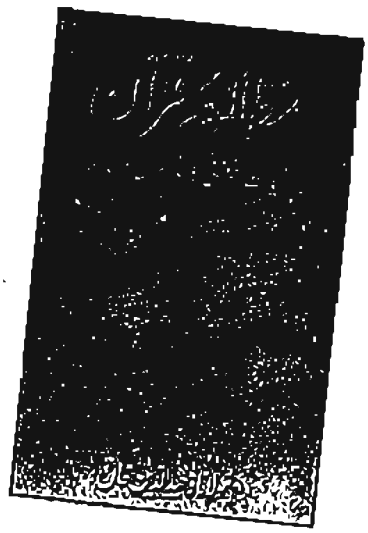

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 435 5454, 435 6666
Fax: 435 7333, 435 7980
e-mail: skhan@vsnl.com

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچہ ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرتعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$ 20/ £10	$ 10/ £5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$ 35/ £18	$ 18/ £8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$ 50/ £25	$ 25/ £12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$ 80/ £40	$ 40/ £18

Books by Maulana Wahiduddin Khan

Islam Rediscovered	195.00
A Treasury of the Quran	75.00
The Quran for All Humanity	75.00
The Quran: An Abiding Wonder	145.00
The Call of the Qur'an	95.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	195.00
Words of the Prophet Muhammad	75.00
An Islamic Treasury of Virtues	195.00
Islam and Peace	150.00
Introducing Islam	195.00
The Moral Vision	145.00
Principles of Islam	145.00
Indian Muslims	65.00
God Arises	125.00
Islam: The Voice of Human Nature	40.00
Islam: Creator of the Modern Age	70.00
Woman Between Islam and Western Society	145.00
Woman in Islamic Shari'ah	125.00
Islam As It Is	70.00
Religion and Science	45.00
Tabligh Movement	40.00
Hijab in Islam	20.00
The Way to Find God	25.00
The Teachings of Islam	50.00
The Good Life	45.00
The Garden of Paradise	45.00
The Fire of Hell	45.00
Islam and the Modern Man	25.00
Uniform Civil Code	20.00
Man Know Thyself	20.00
Muhammad: The Ideal Character	20.00
Polygamy and Islam	20.00
Concerning Divorce	20.00

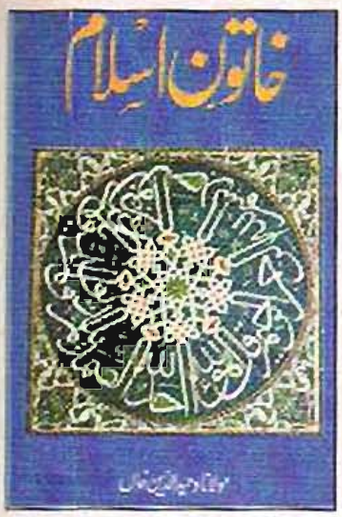

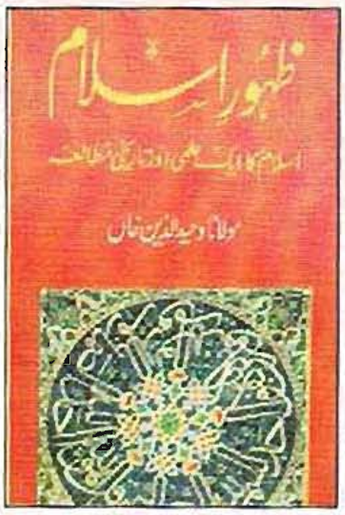

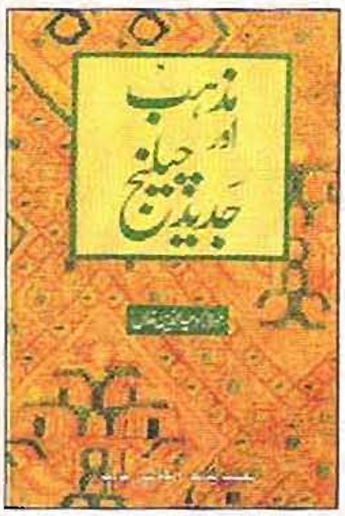

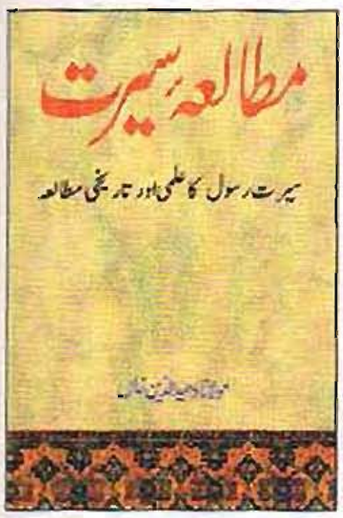

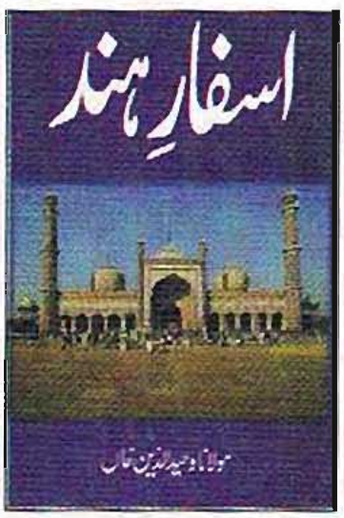

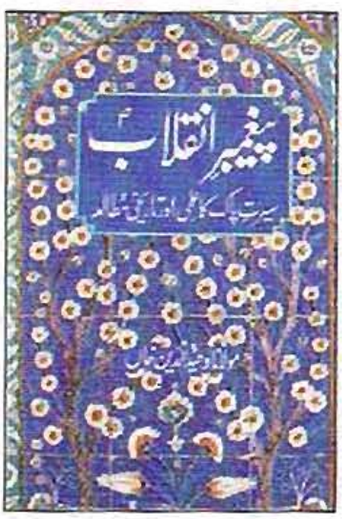

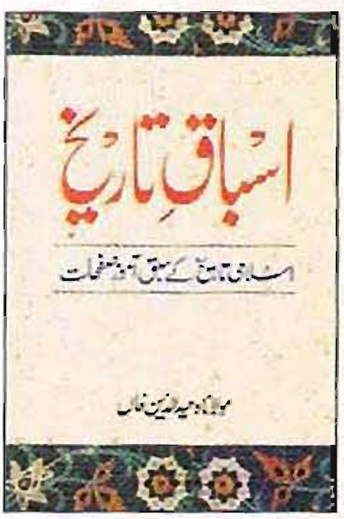

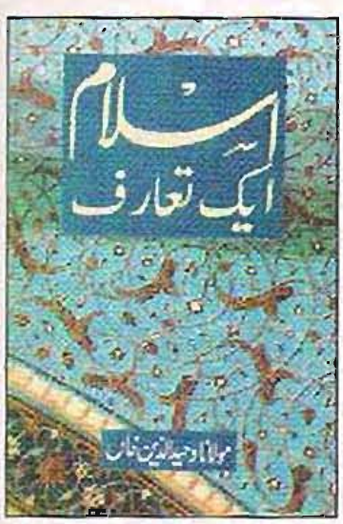

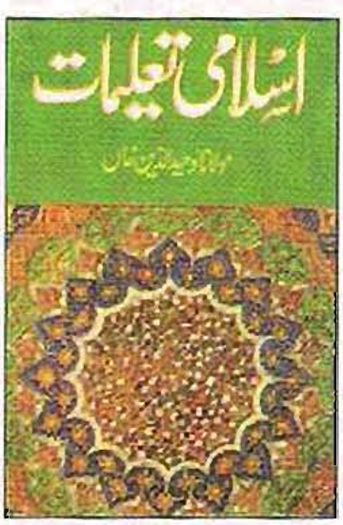

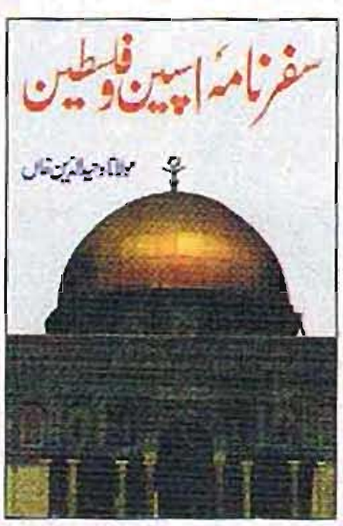

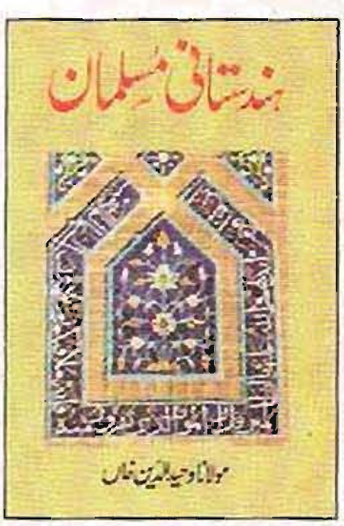

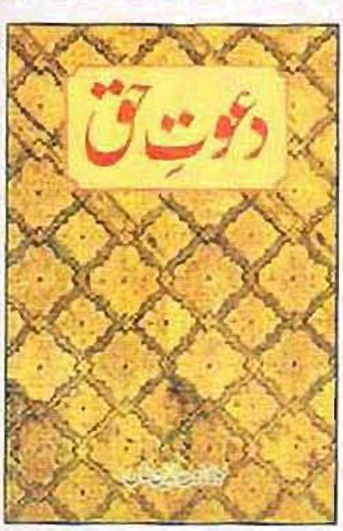

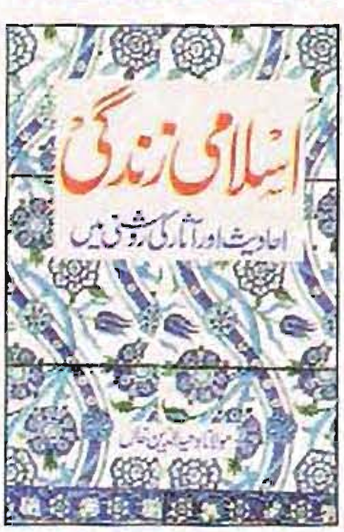

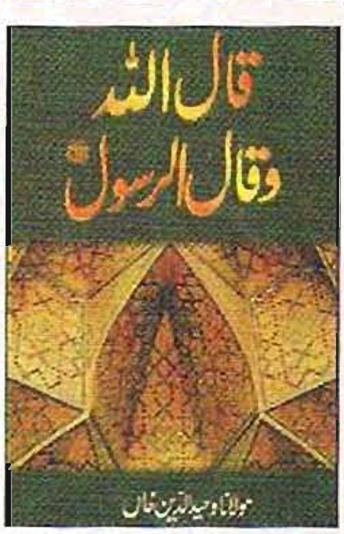

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4625454, 4626666 Fax: 4697333
E-mail: skhan@vsnl.com • Website: alrisala.org